



## زرگزیدہ

سریم کے حنان

فتنہ و فساد کی ایک سدا بہار مثلث ہے جو ازل سے چلی آرہی ہے... ہر جرم اسی مثلث کے کسی کونے سے جنم لیتا ہے اور پھر بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہے... تفتیش کار کسی سراغ کی تلاش میں اسی گوشہ گمنام وہ نشان میں بھٹکتے رہتے ہیں لیکن کہاوت ہے کہ لگن سچی ہو تو سب کچھ مل جاتا ہے... ڈھونڈنے کا ولولہ آخر کار مجرم کے گریبان تک پہنچا ہی دیتا ہے... پھر کوئی دلیل کام نہیں آتی... نان جویں کی جستجو میں شب و روز سرگرداں رہنے والوں پر جب ہن برسے لگتا ہے تو قدم لڑکھڑا جاتے ہیں، راست رویہ راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں... اور گدہ، بھوکے گدہ ایسے بھٹکے ہوئوں کی گھات میں مورچے لگائے بیٹھے ہوتے ہیں جو نشانے پر آجائے، اسی کو گھیر لیتے ہیں، یہ بھول کر کہ ان کے کروتوت انہیں کس طرح بے نام و نشان کر دیں گے... معاشی اور معاشرتی نیک و بد کے تانے بانے سے بنی... چشم کشا کہانی جس میں تجسس اور تحیر کے ساتھ سبق بھی ہے... ان کے لیے جو سیکھنا چاہتے ہیں...

زن، زراور مسین کی تگنوں سے جسم  
لینے والی ایک سنی خیزداستان

حیات احمد طیارے سے اترتا تو اسلام آباد کا موسم بھی سرد ہو رہا تھا لیکن لندن کی سردی کے مقابلے میں یہ ہلکا ہی تھا۔ وہاں قیامت کی سردی پڑ رہی تھی۔ طویل فلائٹ کے بعد وہ اسلام آباد انٹرپورٹ پر اترتا تھا۔ حیات احمد تقریباً اکیس بیس سال کا خوش شکل مرد تھا۔ ہلکی ترشی ہوئی موٹھیں بالوں کی طرح لائٹ براؤن نگر کی تھیں۔ آنکھوں کا رنگ کسی قدر زارک تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ کسی قدر ستا ہوا اور تھکن زدہ لگ رہا تھا۔ اس نے گرم پتلون پر لیدر اور جینز سے بنی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ امیگریشن اور کسٹم کے مراحل سے گزر کر وہ باہر آیا۔ فوراً ہی ٹیکسی اور پرائیویٹ کار والوں نے اس پر یلغار کر دی۔ وہ سب اسے لے جانے پر مصر تھے لیکن اس نے ایک نو جوان سے بات کر لی جس کے پاس ذاتی کار تھی۔

”مجھے مظفر آباد سے ذرا آگے ایک گاؤں شاہ پور تک جانا ہے۔“  
”لے جائے گا صاحب۔“ نو جوان نے متانت سے کہا۔  
دونوں کے درمیان کرائے پر بات ہوئی... اب وہ اپنے گاؤں کی جانب گامزن تھا۔

☆☆☆

شاہ پور وہ قصبہ تھا جہاں حیات احمد نے آنکھ کھولی تھی۔ یہ قصبہ پرانے میرپور کے مہاجرین نے آباد کیا تھا جو منگلا ڈیم کی تعمیر کے بعد وہاں سے بے دخل ہو گئے تھے۔ ان میں جلیلہ اور سجاد احمد بھی شامل تھے۔ اس وقت ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سجاد کی پرانے میرپور میں پوکناں آبائی زمین تھی۔ اس کے بدلے اسے شاہ پور میں چھ کنال زمین اور کچھ رقم بھی ملی تھی جس سے اس نے ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا تھا۔ یہاں زمین اچھی حالت میں نہیں تھی اور نہ ہی سجاد کے پاس اتنا پیسہ اور وقت تھا کہ وہ زمین کو دوبارہ سے آباد کرنا اس لیے اس نے ملازمت کر لی اور ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں ڈرائیور لگ گیا۔ وہ ٹرک چلاتا تھا اور جب وہ باہر جاتا تو جلیلہ اکیلی رہ جاتی۔ اسے اکیلے رہنے سے ڈر لگتا تھا مگر مجبوری تھی۔ بہر حال وہ اچھا دور تھا، اکیلی عورت بھی عزت اور سکون سے اپنے گھر میں رہ جاتی تھی پھر شاہ پور آنے کے بعد ان کے ہاں حیات احمد پیدا ہوا۔

حیات ان کی پہلی اولاد تھا اور شادی کے تین سال بعد پیدا ہوا تھا اس لیے دونوں میاں بیوی خوشی سے نہال تھے۔ پہلی اولاد اور پھر بیٹا ہونے کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ وہ جس ماحول کے بانی تھے، وہاں بچے کی خواہش زیادہ کی جاتی تھی۔ اب جلیلہ کو اکیلے نہیں رہنا پڑتا تھا۔ حیات اس کے لیے رفاقت اور مصروفیت لایا تھا۔ اب سجاد طویل سفر پر کئی سال کے لیے جاتا تو اسے تنہائی اور خوف کا اتنا احساس نہیں ہوتا تھا۔ پھر حیات بڑا ہونے لگا۔ اپنے پیروں پر چلنے اور کھیلنے لگا۔ تین سال کا ہوا تو وہ اپنے گھر کے لیے لگ گیا لیکن جلیلہ اسے گھر سے زیادہ دور جانے نہیں دیتی تھی۔ البتہ

غصے کی شدت سے اس کا دماغ پھٹ رہا تھا۔ رہائی اب ناممکن ہو گئی تھی۔ اس نے ایک زور کی لات اسے ماری۔ وہ چیختی ہوئی درمیانی زینے پر الٹ کر سر کے بل تجلے پائمان پر آ کر گری۔ یہ آخری حملہ تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ لہو فرش پر پھیلنے لگا۔ چوہے دوڑتے ہوئے آئے اور لوہے کے بدن کو جگہ جگہ سے کترنے لگے۔ وہ تو سر چلی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ موٹی دیدے بھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ اسے چتا میں جلنے نہیں دے گا۔ اسے کیڑے کھا کیوں گے اور یہ منظر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔

اور وہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں زخمی تھے اور لہو میں بھیگ رہے تھے۔ چوہے اس پر بھی حملہ کرنے آئے۔ اس نے دوا اسپرے کی۔ وہ دور چلے گئے لیکن کب تک؟ وہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد آتے تھے۔ دوا اسپرے ہو کر فضا میں پھیلتی تھی پھر جلد ہی اس کا اثر زائل ہو جاتا تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ کین خالی ہو گیا۔

بریف کیس بھرا ہوا تھا۔ اور اب بیوارا ہونے والا نہیں تھا۔ پورے دو کروڑ دس لاکھ اس کے ہو گئے تھے۔ ہائے اوہ دولت اب وہاں سے کیسے لے جائے؟ یکبارگی اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ کتنے ہی چوہوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ ”بچاؤ...!“

پہلی بار اس کی چیخ باہر تک آئی۔  
باہر رات اندھیری تھی... گونجی تھی... بہری تھی۔  
”بچاؤ...! کوئی ہے...؟“

کوئی ہوتا تو یہ عبرت ناک تماشہ دیکھتا کہ قبر کے کیڑے زندہ انسان کو کس طرح کھاتے ہیں؟  
اور کوئی ہوتا تو کیا کر لیتا؟ قرنطینہ تو ہے ہی زندہ درگور ہونے کے لیے۔ وہاں آنے والے بیمار ہوں یا بے ایمان ہو کر واپس نہیں جاتے۔  
”کوئی ہے... کوئی ہے جو قرنطینہ سے عبرت حاصل کرے؟“

اندر سے آخری ڈوبتی ہوئی آواز آئی۔ ”کوئی ہے...؟“  
ایک سوال تاریک رات کے سینے میں پیوست ہو گیا۔  
”کوئی ہے...؟“

سوال سوال ہی رہا۔ گرم ہو گیا۔ 31 دسمبر دو ہزار بارہ کی آخری ساعتیں گزر رہی تھیں اور نئے سال کے سورج کی تابانیاں طلوع ہونے کو بے قرار تھیں۔

☆

نے دونوں پیروں کی قینچی میں گردن کو پھنسا لیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ موٹی کے پاؤں اسے ادھر سے ادھر جھٹکے دے رہے تھے پھر وہ نڈھال سی ہو کر جھکی تو اس کا سر زینے کے پائمان سے ٹکرا گیا۔ وہ لوہے کا زینہ تھا۔ سر ٹکراتے ہی پیشانی سے خون اُبل پڑا۔ چوہے اور چھپکلیاں تڑپ کر اس کی طرف آنے لگیں۔ انہیں برسوں سے انسانی لہو کا چمکا پڑا ہوا تھا لیکن وہ قریب نہ آ سکیں۔ موٹی نے ابھی ابھی دوا اسپرے کی تھی۔

اس کمرے میں دور تک خونخوار آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان بھوکوں کا نصیب ان کے لیے دسترخوان بچھا رہا تھا۔

اگرچہ موٹی اسے جکڑے ہوئے تھا۔ اسے چھوڑ نہیں رہا تھا۔ تاہم وہ بھی زخمی ہو رہا تھا۔ ورشا کی گردن کے ساتھ اس کے دونوں پاؤں لوہے کے پائمان سے اور ریلنگ سے ٹکرا رہے تھے۔ پیروں کی جلد پھٹ رہی تھی اور لہو بہنے لگا تھا۔

اور بہتا ہوا لہو بے زبان بھوکوں کی بھوک چمکا رہا تھا۔ ایسے لوگ جو اخلاق اور تہذیب کو نہیں مانتے اور قانون کی گرفت میں نہیں آتے۔ ان کی بھی پکڑ ہوتی ہے اوپر سے... وہ اوپر والا ہی اچانک کسی دن ایسا جھٹکا دیتا ہے کہ تمام مجرمانہ جھٹکنڈے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ پھر انہیں فرار کا اور سلامتی کا راستہ نہیں ملتا۔

ورشا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اب وہ گردن چھڑانے کے لیے جدوجہد نہیں کر رہی تھی۔ موٹی نے نارنج کی روشنی میں اسے دیکھا پھر منہ پر سے ماسک ہٹا کر بولا۔ ”چابی دو۔ ورنہ گردن بھی چھڑا نہیں پاؤ گی۔“

ورشا کی آنکھیں کمزوری کے باعث بند ہو رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ پھر اسے جنگی میں پکڑی ہوئی چابی دکھائی۔ وہ ایک ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”ذرا اوپر آؤ۔ چابی دو۔ میں گردن چھوڑ دوں گا۔“

اس نے چابی کو اس کی طرف بڑھایا جیسے دے رہی ہو پھر اس نے ہاتھ ہینچ لیا۔ چابی کو دور زینے کے نیچے پھینک دیا۔ وہ غصے سے اسے گالیاں دینے لگا۔ ہڈیاں انداز میں چیخنے لگا۔ چابی تاریکی میں کہیں جا کر گرم ہو گئی تھی۔ وہ اپنا ایک ہاتھ کاٹنے کے بعد ہی اسے تلاش کرنے جاسکتا تھا۔

اور ہاتھ کاٹنے کے لیے چاقو ضروری تھا۔  
اور ورشانے پہلے ہی ہتھیار کو ممنوع بنادیا تھا۔



پانچ سال کا ہوا تو اسے اسکول میں داخل کرانا پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ صبح سے دوپہر تک کئی گھنٹوں کے لیے ماں اور گھر سے دور رہتا تھا۔ شروع میں اسے بہت گھبراہٹ ہوئی۔ وہ اسکول میں بے آواز رہتا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ عادی ہو گیا۔ جب وہ دوسری کلاس میں پہنچا تو اسکول شوق سے جانے لگا کیونکہ اسے پڑھنا اچھا لگتا تھا۔

جیلہ اور سجاد کے ہاں دوسری اولاد اس وقت ہوئی جب وہ تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ حیات دس سال کا تھا جب شہزاد پیدا ہوا۔ ماں باپ تو خوش تھے۔ حیات ان سے زیادہ خوش تھا کہ اب وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کا ایک بھائی دنیا میں آ گیا ہے۔ پہلے اسے اسکول سے آنے کی جلدی نہیں ہوتی تھی لیکن اب وہ بے تابی سے چھٹی کے وقت کا انتظار کرتا تھا کہ گھر جائے اور شہزاد کے ساتھ کھیل سکے۔ بھائیوں میں محبت فطری چیز ہوتی ہے لیکن حیات کو شہزاد سے کچھ زیادہ ہی محبت تھی۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ بے قرار ہو جاتا۔ اگر وہ بیمار ہوتا تو حیات کا سکون، چین اور کھانا پینا حرام ہو جاتا۔ اس کی حالت دیکھ کر جیلہ اور سجاد ہنستے۔ جیلہ کہتی۔ ”لگتا ہے شہزاد کی ماں اور باپ یہی ہے، ہم تو بس ایسے ہی ہیں۔“

جیسے جیسے شہزاد بڑا ہوتا گیا، وہ خود بہ خود بھائی سے قریب ہوتا گیا۔ اگر انسان کو اس کی حیثیت سے زیادہ محبت ملنے لگے تو وہ مغرور ہو جاتا ہے اور اس محبت کو اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔ ایسا ہی شہزاد کے معاملے میں ہوا۔ حیات کی محبت نے اسے مغرور کر دیا۔ وہ حیات پر اپنا حق سمجھنے لگا اور اس حق کو بے دریغ استعمال کرنے لگا۔ تین چار سال کی عمر میں وہ حیات کو اپنے اشاروں پر چلانے لگا۔ وہ اپنا کام اور تفریح چھوڑ کر شہزاد کی خواہشات پوری کرتا۔ روز شام کے وقت وہ شہزاد کو باہر لے جاتا۔ اسے گھماتا پھراتا اور کھلاتا۔ اس عمر میں جیلہ اسے باہر نہیں جانے دیتی تھی اس لیے اسے کھیلنے کا موقع نہیں ملا اور جب اس کے خود سے باہر جا کر کھیلنے کی عمر آئی تو شہزاد دنیا میں آ گیا۔ یوں اسے موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اپنے لیے کچھ وقت نکال سکے۔

میٹرک کے بعد حیات نے شاہ پور سے ذرا دور شہر کے پاس ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں شہزاد نے اسکول جانا شروع کیا تھا اور ان ہی دنوں شکیلہ پیدا ہوئی۔ شہزاد کی محبت حیات کے دل میں خود پیدا ہوئی تھی لیکن شکیلہ ان بچوں میں سے تھی جو دوسروں کو اپنی جانب خود متوجہ کر لیتے ہیں۔ آنے والے پانچ برسوں تک حیات پر شکیلہ کا قبضہ رہا۔ اس

دوران میں اس نے گریجویشن کر لیا تھا۔ قدرت کے کاموں میں کتنی ٹائمنگ ہوتی ہے۔ کم سے کم جیلہ اور سجاد کے لیے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ میر پور سے در بدر ہونے کے بعد تین سال تک ان کی اولاد نہیں ہوئی۔ جب وہ سیٹ ہو گئے تو قدرت نے انہیں اولاد کی نعمت سے نوازا۔

اب تک قدرت کی ٹائمنگ ان کے فیور میں تھی لیکن اچانک اس میں بدلاؤ آ گیا۔ ادھر حیات نے تعلیم مکمل کی اور ادھر سجاد ایک حادثے میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ وہ جو ٹرک لے کر شہر جا رہا تھا، اس پر منجائش سے زیادہ بھل لدا ہوا تھا۔ اوور لوڈنگ کی وجہ سے ٹرک بے قابو ہو کر ایک کھالی میں جا گرا اور سجاد موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ غربت تھی لیکن فاقے اور تنگ دستی نہیں تھی۔ وہ روکھی کھاتے لیکن تینوں وقت کھاتے تھے۔ مگر سجاد کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی فاقوں اور تنگ دستی کا عفریت منہ پھاڑے سامنے آ گیا ہوا۔ جیلہ ہم گئی کہ اب کیا ہوگا۔ آنے والی بھوک کے خوف سے شہزاد کے آنسو خشک ہو گئے۔ شکیلہ ابھی چھوٹی تھی، اسے ماں سے خوراک مل جاتی تھی اس لیے اس کے صے کی فکر بھی جیلہ کو کرنا پڑ رہی تھی۔

مگر حیات نے ہمت کی۔ اس نے جیلہ سے کہا۔ ”امی! آپ فکر نہ کریں۔ اب نہیں ہیں مگر میں تو ہوں... میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں آپ لوگوں کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔“

جیلہ رونے لگی۔ حیات صرف بیس سال کا تھا۔ اس عمر کے لڑکے بے فکری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں گھر والوں کی تو کیا کمانے کی فکر بھی نہیں ہوتی اور حیات پورے گھر کا بوجھ سر پر لے رہا تھا۔ یہ قدرت کا انوکھا رواج ہے کہ بھرے پڑے گھر کو ایک باپ جتنی آسانی سے چلا لیتا ہے، اسی گھر کو کوئی دوسرا فرد بہت مشکل سے چلاتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی مخلص اور محنتی کیوں نہ ہو۔ اب تک حیات کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے باپ کی آمدنی کیا تھی لیکن اس نے گھر اور گھر کے کسی فرد کی ضرورت کو رکھتے نہیں دیکھا تھا۔

سجاد کے بعد حیات کو معلوم ہوا کہ ان کے پاس کوئی جمع پونجی نہیں تھی کیونکہ سجاد جو کما تا تھا، وہ اپنے گھر پر خرچ کر دیتا تھا۔ ان بیس سالوں میں اس نے زمین پر محنت کر کے سیب اور آڑو کا باغ لگا لیا تھا۔ مگر یہ بہت اچھی کوائی کا نہیں تھا اس لیے سال میں جب پھل اترتا تو انہیں بہت زیادہ نہیں ملتا تھا۔ زمین کے کچھ حصے پر ذاتی ضرورت کے لیے سبزی لگا رکھی تھی۔ اسی طرح دو بکریاں اور چند مرغیاں پال

رہی تھیں جن سے گھر کے دودھ اور انڈوں کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ بکریاں جو بچے دیتی تھیں، انہیں وہ بڑی عید پر زبان کر لیا کرتے تھے۔ حیات کو اسی کہنی میں ملازمت مل گئی جہاں سجاد ڈرائیور تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا اس لیے اسے حساب کتاب کا کام دے دیا گیا مگر تنخواہ اتنی نہیں تھی۔ حیات نے انکار نہیں کیا۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہی تھا۔ اسے آگے بڑھنے اور ماسٹر کرنے کا شوق تھا مگر اب یہ شوق دل میں ہی رہ گیا۔

حیات کی نوکری سے گھر کی گاڑی چلنے لگی۔ تنخواہ کم تھی اور مہنگائی بڑھ رہی تھی اس لیے گزارہ مشکل ہو رہا تھا۔ شہزاد اور شکیلہ جیسے جیسے بڑے ہو رہے تھے، ان کے اخراجات بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ ان کی خواہشات پوری کرنے کے لیے حیات خود پر جبر کرتا تھا۔ پرانے کپڑوں اور جوتوں میں گزارہ کرتا۔ اس نے کوئی ایسی علت نہیں پالی تھی جس پر اسے رقم خرچ کرنی پڑے۔

ابتدا میں شاہ پور غریبوں کا قصبہ تھا۔ بے دخل ہو کر آنے والے اپنی زندگی دوبارہ سے تعمیر کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ حکومت کے ساتھ دنیا والے بھی ان کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ خاص طور سے برطانیہ نے ان لوگوں کے لیے اپنے ملک کے دروازے کھول دیے تھے اور انہیں بہت آسانی سے برطانیہ کا ویزا اور نیشنلسٹی مل رہی تھی۔ شاہ پور کے کچھ لوگ بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ چلے گئے۔ انہوں نے وہاں محنت کی اور کما کر گھروالوں کو بھیجا۔

ان کے حالات بدل گئے۔ انہوں نے اپنے کچے مکانوں کی جگہ خوب صورت اور بکے مکانات بنوا لیے۔ اپنی زمینوں کو آباد کیا اور ان کے گھروں میں زندگی کی سہولتیں اور آسائشیں آ گئیں۔

اس کا یا پلٹ نے دوسروں کو بھی للچایا اور وہ بھی باہر جانے کی تنگ و دو میں لگ گئے۔ یہ زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے باہر جانے والوں کا ایسا تانتا بندھا کہ شاہ پور کے نصف مرد باہر چلے گئے اور آنے والے دس سالوں میں شاہ پور کا حلیہ ہی بدل گیا۔ شاہ پور ایک غریبانہ بستی سے ایک خوشحال اور خوب صورت قصبے میں بدل گیا۔

اس تبدیلی کا اثر ان گھرانوں پر تو مثبت ہوا جو اس تبدیلی سے براہ راست مستفید ہوئے تھے لیکن وہ گھرانے جن کا کوئی فرد باہر نہیں تھا اور وہ یہیں رہ کر کمار رہے تھے، ان کی غربت زیادہ نمایاں ہونے لگی۔ اپنے آس پاس ہونے والی تبدیلیوں کا انہوں نے اثر لیا۔ جب سب ایک جیسے تھے تو

کسی کو احساس نہیں تھا کہ وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے لیکن جب ان میں سے کچھ پیسے والے ہو گئے تو باقیوں کو پتا چلا کہ وہ کیسی زندگی گزار رہے ہیں اور ان کی زندگی میں کیا کیا کمی ہے۔ اس تبدیلی کا آغاز حیات کے بچپن میں ہو گیا مگر جب وہ بڑا ہوا اور باپ کے مرنے کے بعد اس نے گھر کی ذمہ داری سنبھالی، تب تک شاہ پور مکمل تبدیل ہو چکا تھا۔ حیات نے سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ شہزاد کو بھی اسی اسکول میں داخل کر لیا گیا مگر اسے یہ اسکول پسند نہیں تھا۔ وہ اس پرائیویٹ اسکول میں پڑھنا چاہتا تھا جہاں اب شاہ پور کے امراء کے بچے پڑھتے تھے مگر اس کی فیس برداشت کرنا ان کی اوقات سے باہر تھا۔ اس لیے شہزاد صند کے باوجود سرکاری اسکول میں پڑھتا رہا۔

شہزاد، حیات سے بالکل مختلف تھا۔ حیات میں جتنا صبر تھا، شہزاد میں اتنی ہی ضد تھی۔ وہ ہر اچھی چیز چاہتا تھا اور اسے کبھی خیال نہیں آتا کہ اس کا تعلق ایک غریب گھر سے ہے جہاں انہیں کھانے پینے کے ساتھ مناسب سہولتیں مل رہی ہیں۔ مگر تعیشت کی کوئی منجائش نہیں تھی۔ شہزاد چاہتا تھا کہ اس کے پاس بھی وہ سب ہو جو دوسرے بچوں کے پاس ہے۔ سرکاری اسکول میں بھی امیر گھرانے کے بچے آتے تھے۔ ان کے پاس کافی پیسے ہوتے تھے اور وہ کھل کر خرچ کرتے تھے جبکہ شہزاد کو ایک روپیہ جیب خرچ ملتا تھا۔ کبھی کبھی حیات ماں سے چھپ کر اسے دو روپے دے دیتا تھا لیکن اس سے اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو اس سے کہیں زیادہ چاہتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا، اس کی حسرتیں اور خواہشیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ جب وہ بھائی یا ماں سے کوئی خواہش کرتا اور وہ پوری نہیں ہوتی تو شہزاد جھنجھلا جاتا۔

”دوسروں کے پاس بھی تو یہ سب ہے۔“  
”ان کے پاس دولت ہے۔“  
”تو ہمارے پاس کیوں نہیں ہے؟“  
”کیونکہ ان کے گھروں میں باہر سے پیسا آتا ہے۔“  
شہزاد سوچتا کہ اگر حیات باہر چلا جائے تو ان کے گھر میں بھی پیسا آئے گا اور پھر انہیں کسی چیز یا کسی خواہش کے لیے ترسنا نہیں پڑے گا۔ مگر وہ ماں یا بھائی سے یہ بات کہہ نہیں سکتا تھا، اس لیے اندر ہی اندر جلتا اور کڑھتا۔ شکیلہ بھی تقریباً اسی کی فطرت کی تھی۔ اسے بھی خواہش تھی کہ ان کے پاس ڈھیروں پیسے ہوں اور ان کے گھر میں تفریح اور سہولت کی ہر چیز ہو۔ اس کی سہیلیوں کے گھر سب کچھ تھا۔ حیات نے کوشش کر کے حساب کتاب کا کام سیکھ لیا۔



اب وہ پہنی کا سارا حساب دیکھتا تھا مگر تنخواہ میں خاص فرق نہیں آیا جبکہ پانچ سالوں میں مہنگائی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اب شکلیہ سیکنڈری اسکول جانے لگی تھی اور اس کے اخراجات بھی بڑھ گئے تھے۔ اپنے گھر کے حالات اور پھر بہن بھائی کو دیکھتے ہوئے حیات کو خیال آنے لگا کہ اسے بھی باہر چلے جانا چاہیے۔ جب اس نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو کئی جانے والوں اور دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ باہر چلا جائے۔ یہاں جتنی محنت کرتا ہے اگر باہر کرے گا تو چند سالوں میں زندگی بنالے گا۔ مگر اس وقت شہزاد بھی چھوٹا تھا اور شکلیہ بھی۔ جیلہ کو باہر کا زیادہ پتا نہیں تھا، حیات انہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے شہزاد کا خیال تھا۔

حیات دیکھ رہا تھا کہ دولت کے ساتھ ساتھ معاشرے میں کتنی تیزی سے بگاڑ بھی آ رہا تھا۔ غربت میں جو گھرانے وضع دار اور مقامی رسم و رواج کے پابند تھے، دولت آنے پر ان میں ایسی تبدیلیاں آئیں جو حیران کن تھیں۔ وہ اپنے رواج چھوڑ کر وہاں کے رواج اپنانے لگے جہاں سے یہ دولت آ رہی تھی۔ لیکن مثبت انداز میں نہیں بلکہ منفی انداز میں۔ ان کی اولاد شتر بے مہار ہو گئی تھی۔

اسی لیے وہ باہر جاتے ہوئے ڈر رہا تھا اور اس نے اپنے دوستوں کو انکار کیا کہ ابھی وہ باہر نہیں جاسکتا۔ مگر اب شہزاد بڑا ہو گیا تھا۔ ضدی اور خواہشوں کے پیچھے بھاگنے کے باوجود وہ اچھا طالب علم تھا۔ اس نے میٹرک میں پورے اسکول میں ٹاپ کیا تھا اور اسے شہر کے ایک اچھے کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ یہاں کے اخراجات زیادہ تھے اور پھر حیات چاہتا تھا کہ شہزاد انٹر کے بعد کسی پرفیشنل ڈگری کورس میں داخلہ لے۔ اس کے لیے کافی رقم چاہیے تھی۔ اس لیے اس نے دل پر پتھر رکھ کر باہر جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ اب وہ اپنے گھر والوں کو غربت کی چکی میں مزید پستے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ماں سے کہا۔ ”امی! میں باہر جانے کا سوچ چکا ہوں۔ اب آپ خود کو تیار کریں، گھر آپ کو دیکھنا ہے۔“

جیلہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”شھیک ہے میرے بچے... اس زندگی پر تمہارا حق بھی ہے۔ تم کب تک ہماری خاطر یونہی محنت کی چکی میں پستے رہو گے؟“

”بس یہی سوچ کر باہر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہاں میں اتنا کماسکوں گا کہ گھر بنانے کے ساتھ شہزاد کی اعلیٰ تعلیم اور شکلیہ کی کسی اچھی چمک شادی کا خرچ بھی اٹھا سکوں گا۔“

جیلہ سمجھ رہی تھی کہ حیات یہاں ساری عمر بھی ملازمت

کرتا رہے گا تو کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس نے کہا۔ ”شھیک ہے میرے بچے میں ہمت کر لوں گی مگر تم باہر جاؤ گے کیسے؟ اس کے لیے تو بہت رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”امی! میں ادھار لے لوں گا۔ جب کمائے لگوں گا تو ادا کر دوں گا۔“

باہر جانا حیات کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ اسے ویزا آسانی سے مل جاتا۔ قرض دینے والے بھی تھے اور باہر جانے والے بھی تھے جو اسے سہیل کر سکتے تھے۔ اس نے کوشش کی اور دو مہینے بعد ہی اس کا ویزا لگ گیا۔ جب وہ لندن پہنچا تو اس کے لیے ملازمت بھی تیار تھی۔ کام محنت والا تھا لیکن اس میں آمدنی بھی اور حیات یہاں کمائے آیا تھا۔ اگر اسے زیادہ محنت کرنا پڑتی تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے گھر والوں کو پُر آسائش زندگی دینا چاہتا تھا۔ ایک مہینے بعد اس نے اتنی رقم کا ڈرافٹ بھیجا جو ملک میں اس کی چھ مہینے کی تنخواہ سے بھی زیادہ کا تھا۔ اس کے بعد وہ ہر مہینے اتنی ہی رقم گھر بھیجنے لگا۔ دو سال بعد وہ واپس آیا اور اس نے اپنے سامنے کھڑے ہو کر اپنا مکان نئے سرے سے بنوانا شروع کیا۔ گھر والوں کی حالت پہلے ہی بدل چکی تھی۔ مگر گھر اسی حالت میں تھا۔ حیات بہت خوش تھا کہ اس نے بالآخر وہ سب کر لیا تھا جو وہ اپنے گھر والوں کے لیے چاہتا تھا۔

لیکن پہلا دھچکا اس وقت لگا جب اسے معلوم ہوا کہ شہزاد ایف ایس سی میں صرف بی گریڈ حاصل کر سکا تھا۔ اس گریڈ کے ساتھ اسے کسی پروفیشنل ڈگری میں داخلہ ملنا ناممکن تھا۔ حیات افسوس کر کے رہ گیا۔ بہر حال اس نے شہزاد سے کہا کہ وہ آگے تعلیم حاصل کرے۔ تین مہینے بعد وہ واپس جا رہا تھا تو اس کے پرانے گھر کی جگہ چار بیڈ رومز کی خوب صورت کونوی کا اسٹرکچر کھڑا ہو گیا تھا۔ فٹنگ کا کام بعد میں شہزاد نے تقریباً ایک سال میں مکمل کر لیا اور اس پر اتنی لاگت آئی جتنی کہ پوری کونوی کھڑی کرنے پر آئی تھی۔ حیات حیران تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس کے بعد اسے دوبارہ گھر آنے کا موقع نہیں ملا۔ آنے والے چار برس وہ یہ سوچ کر کما تا رہا کہ اب ایک ہی بار طویل چھٹی پر واپس جائے گا۔ اپنی اور شہزاد کی شادی کے ساتھ اگر مناسب رشتہ ہوا تو شکلیہ کی شادی بھی کر دے گا۔

ان کی زمین ویسے ہی پڑی تھی بلکہ پرانا باغ دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے ختم ہو رہا تھا۔ حیات نے جانے سے پہلے ایک ماہر سے بات کی اور شہزاد سے کہا کہ ماہر کی مدد سے زمین پر بہترین درختوں کے باغ لگوائے۔ اپنی طبیعت

کے برخلاف شہزاد نے یہ کام پوری دلچسپی سے کیا۔ اس نے رتی ماہر کے ساتھ مل کر زمین پر سیب، آڑو، ناشپاتی اور انگور کی بہترین اقسام لگوائیں۔ جانے سے پہلے حیات نے زمین کے ساتھ ملی ہوئی کچھ زمین اور لی تھی۔ اب ان کا فارم پہاڑی کی سڑک تک آتا تھا اور انہیں دوسروں کی زمین سے گزرنا نہیں پڑتا تھا۔ جب پھل کا سیزن آتا تو فارم میں کئی ملازم کام کرتے اور جب سیزن گزر جاتا تو صرف ایک رکھوالا رہتا۔

”جناب!“ ڈرائیور... نے کہا تو وہ چونکا۔ ”اب کہاں جانا ہے؟“

وہ منظر آباد پہنچ گئے تھے۔ حیات اسے راستہ بتانے لگا۔ یہاں سے شاہ پور کا راستہ تقریباً پون گھنٹے کا تھا لیکن اب ہائی وے بہت اچھی حالت میں تھی۔ اسے نہ صرف کشادہ کیا گیا تھا بلکہ پہلے کے مقابلے میں یہ ہموار بھی تھی اس لیے وہ صرف آدھے گھنٹے بعد شاہ پور میں اپنے گھر کے سامنے تھا۔ سردی شدید تھی کیونکہ برف باری ہو چکی تھی۔ درخت ٹنڈ ٹنڈ اور مرجھائے ہوئے تھے۔ وہ کرایہ دے کر بیگ اٹھائے ست قدموں سے کونوی کی طرف بڑھا۔ کونوی کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر بہت لوگ تھے کیونکہ باتیں کرنے کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا تو کسی نے اسے دیکھ لیا۔ فوراً ہی شور مچ گیا۔ ”حیات احمد آ گیا ہے۔“

اندر سے روتی ہوئی جیلہ نکلی اور اس سے لپٹی تو وہ بھی پیر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا۔ اس کے حلق سے دھاڑ نکلی تھی۔ ”شہزاد۔“

شہزاد اندر کفن میں لپٹا... بھائی کا منتظر تھا کہ وہ آئے اور اسے دفنائے۔

☆☆☆

”ڈی ایس پی ممتاز ڈار۔“ پولیس وردی میں ملبوس جوان العمر آدمی نے حیات سے تعارف کرایا۔ حیات نے ہاتھ ملایا۔

”حیات احمد... میں شہزاد کا بڑا بھائی ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ ڈی ایس پی نے رکی تعزیت کے انداز میں کہا۔ ظاہر ہے وہ پولیس میں تھا اور آئے دن اس کا واسطہ لاشوں اور ان کے لواحقین سے پڑتا تھا۔ شہزاد احمد کا کیس اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ شہزاد کی تدفین کے اگلے دن شام کے وقت حیات سے ملنے آیا تھا۔ ابھی تک مدعی کی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی تھی کیونکہ جیلہ کو اپنا ہوش نہیں تھا اور شکلیہ صرف سترہ سال کی تھی۔ ”میں ایف آئی آر کے لیے

زر گزیدہ

حاضر ہوا ہوں۔“

”آپ مجھے کیس کی ابتدائی تفتیش کے بارے میں بتائیں گے؟“

”جی بالکل۔“ ڈی ایس پی نے کیس کی فائل کھولی۔ ”آج چوبیس دسمبر ہے۔ اکیس دسمبر کی رات دو بج کر چالیس منٹ پر پولیس کو شاہ پور اور مظفر آباد کو ملانے والی شاہراہ پر سڑک سے ذرا ہٹ کر شہزاد احمد کی لاش ملی۔ لاش درخت کے کٹے حننے کے ساتھ پڑی تھی اور اس موسم میں اس نے صرف شرٹ اور پینٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ کے سارے بٹن کھلے تھے اور جسم پر خراشوں اور چوٹوں کے نشانات تھے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ قاتل یا قاتلوں سے لڑتا رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم کے مطابق موت کی وجہ بائیں کٹہی پر لگنے والی شدید ضرب تھی جس نے دماغ کو متاثر کیا۔ ضرب اس موٹی لکڑی سے لگائی گئی تھی جو لاش کے پاس پڑی پائی گئی۔ موت کا وقت اندازاً ایک بجے کے آس پاس تھا۔ یعنی جب پولیس پارٹی نے لاش دیکھی تو شہزاد اس سے پونے دو گھنٹے پہلے دم توڑ چکا تھا۔“

حیات کے چہرے پر کرب کے تاثرات نمودار ہوئے لیکن فوراً ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ ”یعنی یہ طے ہے کہ شہزاد کی موت کسی حادثے سے نہیں بلکہ قتل کا نتیجہ ہے؟“

”بالکل یہ طے ہے۔ جائے وقوعہ سے پولیس کو شہزاد احمد کے جوتوں کے نشانات کے علاوہ دو قسم کے جوتوں کے نشانات اور ملے ہیں۔“

”کیا وہ قاتلوں کے نشانات ہیں؟“ حیات پرجوش ہو گیا۔

”ممکن ہے اگر کوئی مشکوک فرد ہمارے ہاتھ لگے تو ہم موازنہ بھی کر سکتے ہیں۔“

”یہ بھی ممکن ہے وہ جائے وقوعہ پر جانے والی پولیس پارٹی کے جوتوں کے نشانات ہوں۔“

”نہیں، ان کے نشانات الگ تھے۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔ ”ابتدائی کارروائی کے بعد پولیس نے جب تفتیش شروع کی تو شہزاد احمد کی جیب اسی شاہراہ پر دو کلومیٹر دور شاہ پور کی سمت میں خالی کھڑی پائی گئی۔ اس کے دروازے کھلے تھے اور اس میں ہمیں ایک سوٹ کیس ملا جس میں کسی عورت کے کپڑے اور دوسری چیزیں تھیں۔ یہ تمام خواتین کے استعمال کی چیزیں تھیں۔“

حیات چونک گیا۔ ”اس کا مطلب ہے جس وقت یہ



واقعہ پیش آیا، شہزاد کے ساتھ کوئی عورت بھی گاڑی میں تھی؟ اس کا کچھ پتا چلا کہ وہ کہاں گئی؟“  
”نہیں، ہمیں آس پاس کسی عورت کا سراغ نہیں ملا۔“  
ڈی ایس پی نے کہا۔ ”سوٹ کیس میں موجود چیزوں سے بھی کوئی سراغ والی چیز نہیں ملی۔“  
”شہزاد احمد کی شناخت کیسے ہوئی؟“

”اس کے پاس ملنے والے پرس سے۔ اس میں اس کا آئی ڈی کارڈ موجود تھا۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ گزشتہ چار سال سے ملک سے باہر تھے اور اس دوران میں یہاں نہیں آئے؟“

”یہ درست ہے۔“ حیات نے گہری سانس لی۔  
”آپ جانتے ہیں باہر جانے والے صرف ایک فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کمالیں اور اس کے لیے وہ گھر بھی نہیں آتے۔ یہی میں نے بھی کیا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ یہاں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے ہوں گے۔“ ڈی ایس پی ممتاز نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ کو کچھ اندازہ تو ہوگا کہ شہزاد کی کن لوگوں سے دشمنی تھی؟“

”بدقسمتی سے میں بالکل بے خبر ہوں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ وہ گریجویشن کر کے ایم بی اے میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ اس نے بڑی مشکل سے گریجویشن کیا تھا۔“

”مجھے بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ شہزاد غلط صحبت کا شکار تھا۔ وہ نہ صرف شراب کا عادی تھا بلکہ شاید مارفین کا نشہ بھی کرتا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں پر ایسے سیاہ نشان تھے جو انجکشن کے ہوتے ہیں۔“

حیات کے لیے یہ واقعی انکشاف تھا۔ اسے یہ اندازہ تو تھا کہ شہزاد نے امیروں والے شوق اپنا لیے تھے لیکن وہ شراب اور مارفین کے نشے کا عادی ہو گیا تھا۔ پھر عورت والا معاملہ بھی تھا۔ گویا وہ اس کے اندازے سے کہیں زیادہ بگڑ گیا تھا۔ حیات چاہتا تھا کہ جیسے ہی شہزاد گریجویشن مکمل کرے، وہ اسے باہر بلوالے۔ مگر اول اس نے تین سال میں جا کر گریجویشن کے پیمپرز تکسیر کیے۔ پھر اس نے برطانیہ آنے سے انکار کر دیا۔ حیات نے برطانیہ میں ہی اکاؤنٹس کے کچھ کورس کیے تھے اور اب ایک ملٹی نیشنل فرم میں جاب کر رہا تھا۔ اس کا ابتدائی مشکل وقت گزر گیا تھا۔ وہ شہزاد کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ نہیں مانا اور پھر اچانک اس کی موت کی اطلاع آگئی۔ اب ڈی ایس پی اسے بتا رہا تھا کہ شہزاد کن راہوں پر چل نکلا تھا۔ اس نے حیات سے کہا۔

”آپ کو کسی پر شک نہیں ہے کیونکہ آپ نہیں جانتے کہ شہزاد کا کن لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا اور وہ کن چکروں میں تھا۔ مجھے شک ہے کہ وہ کسی عورت کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اتنی رات گئے اس کی گاڑی میں پائے جانے والے لیڈر پکڑوں کے سوٹ کیس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کسی عورت کے ساتھ تھا۔ گاڑی کا رخ شاہ پور کی طرف تھا اس لیے امکان یہی ہے کہ وہ عورت کو گھر لارہا تھا مگر راستے میں قاتلوں نے اسے روکا۔ اس نے مزاحمت کی اور ان سے بچنے کے لیے بھاگا مگر قاتلوں نے بالآخر اسے پکڑ لیا اور مار ڈالا۔“  
”وہ عورت کہاں گئی جو شہزاد کے ساتھ تھی؟“

”میرا ذاتی خیال ہے کہ اسی عورت کے گھر والے یا اس میں دلچسپی لینے والا کوئی دوسرا فرد پیچھے آیا تھا اور شہزاد کے قتل کے بعد وہی عورت کو واپس لے گئے۔“

”اگر وہ اس کے گھر والے نہیں تھے تو اب تک اس کی گمشدگی کی اطلاع پولیس تک پہنچ جانی چاہیے تھی۔“  
ڈی ایس پی نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ ”آپ نے ٹھیک کہا۔ اس سے شک ہوتا ہے کہ وہ عورت کے گھر والے تھے۔“

حیات نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”قاتل نامعلوم ہیں یعنی اب مجھے نامعلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کرانی ہو گی۔“

”فی الحال تو یہی کیا جاسکتا ہے۔“

حیات کو پولیس سے زیادہ توقع بھی نہیں تھی۔ انگلیڈ میں رہ کر اسے وہاں کی پولیس اور مقامی پولیس کا فرق اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا۔ ہماری پولیس کی کارکردگی اس مشین کی طرح تھی جو رنگ آلود پڑزوں پر مشتمل تھی اور اس میں آئل کی بھی کمی تھی۔ اس لیے اس کی کارکردگی بھی فرسودہ تھی۔ مقامی پولیس نے ابتدائی تفتیش مکمل کر لی تھی۔ اب تک وہ جیلہ اور شکیلہ سے بات نہیں کر سکا تھا۔ اس نے حیات سے کہا۔ ”میں آپ کی موجودگی میں آپ کی والدہ اور سسٹر سے بات کرنا چاہوں گا۔“

”والدہ کی طبیعت تو ٹھیک نہیں ہے۔“ حیات نے معذرت کی۔ ”وہ سو رہی ہیں۔ ہاں شکیلہ سے آپ بات کر سکتے ہیں۔“

شکیلہ سترہ سال کی دلکش اور نازک اندام لڑکی تھی۔ سرخ و سفید رنگت اور لیئرکنگ بالوں کی وجہ سے اور بھی دلکش لگ رہی تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے پر غم انگیز تاثرات تھے۔ البتہ اس نے جدید فیشن کا تقریباً نیا سوٹ پہن رکھا

تھا۔ اس نے ڈی ایس پی کے سوالوں کے جواب میں اسے بتایا کہ اس دن شہزاد شام سات بجے گھر سے چلا گیا تھا۔ اس نے ماں اور اسے بتایا تھا کہ وہ دوستوں کے پاس جا رہا ہے لیکن جب وہ رات دو بجے تک نہیں آیا تو شکیلہ نے جیلہ کے کہنے پر اس کے تین قریبی دوستوں قدیر، شارق اور منصور کو کال کی تھی۔ لیکن ان تینوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ شہزاد ان کے پاس نہیں آیا بلکہ گزشتہ دو دن سے انہوں نے شہزاد کو نہیں دیکھا تھا۔ پریشان ہو کر انہوں نے دوسرے واقف کاروں کے ہاں کال کی لیکن شہزاد کا کسی کو علم نہیں تھا۔ اس روز جیلہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ جلدی سو مٹی تھی اور پھر اسے شکیلہ نے بیدار کیا۔ پھر فکر کی وجہ سے جیلہ کی نیند اڑ گئی اس لیے جب صبح چار بجے پولیس کی طرف سے کال آئی تو وہ جاگ رہی تھی اور پھر اس کی چٹیں سن کر شکیلہ بھی جاگ گئی تھی۔ جیلہ بے ہوش ہو گئی اور شکیلہ نے فون مارتا تو شہزاد کے بارے میں سن کر اس کے حواس بھی تھل ہو گئے۔

”کیا وہ پہلے بھی رات گئے گھر سے غائب رہتا تھا؟“  
”نہیں، شہزاد بھائی رات بارہ بجے تک لازمی گھر آ جاتے تھے کیونکہ گھر میں بس میں اور امی ہوتے تھے۔“

”گھر میں اس کے دوست آتے تھے؟“  
”نہیں، شہزاد بھائی ان سے باہر ہی ملتے تھے۔ شاید وہ تین چار بار ہی گھر آئے ہوں گے۔“

”کبھی کوئی عورت شہزاد کے ساتھ آئی؟“  
شکیلہ نے چونک کر ڈی ایس پی کو دیکھا۔ ”نہیں، ان کے ساتھ کبھی کوئی عورت گھر میں نہیں آئی۔“

”شہزاد کسی عورت یا لڑکی سے ملنے جاتا تھا؟“  
شکیلہ نے بے بسی سے بھائی اور ڈی ایس پی کی طرف دیکھا۔ ”اگر وہ کسی سے ملتے تھے تو مجھے اس کا علم نہیں ہے۔“  
”مسٹر حیات! میں شہزاد کا کمراد دیکھنا چاہوں گا۔“  
ڈی ایس پی نے کہا تو حیات کھڑا ہو گیا۔  
”آئیے میرے ساتھ۔“

ممتاز اور حیات شہزاد کے بیڈروم میں آئے۔ اب تک حیات نے بھی یہاں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ اندر آیا تو اسے لگا کہ ابھی شہزاد کہیں سے نکل کر آئے گا۔ بستر پر اس کے اتارے ہوئے کپڑے بکھرے ہوئے تھے اور ڈریسنگ ٹیبل پر ایک پرفیوم کی شیشی کھلی پڑی تھی جیسے شہزاد غفلت میں اچھڑے کر کے گیا ہو۔ حیات نے بے خیالی میں اس پرے کیا تو مگور کن خوشبو فضا میں بکھر گئی۔ ممتاز نے اس کی طرف

دیکھا۔ ”آپ کی اجازت سے...“  
حیات نے سر ہلایا تو ممتاز نے کمرے کی تلاشی لینا شروع کی۔ سب سے پہلے اس نے ڈریسنگ کی درازیں چیک کیں۔ ان میں کچھ نہیں تھا۔ پھر اس نے الماری کھولی۔ اس کے لاکر سے نوٹوں کی چند گڈیاں جو ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی تھیں اور دو شراب کی بوتلیں برآمد ہوئیں۔ حیات شرمندہ ہو گیا۔ اس کا مطلب شہزاد اس حد تک بگڑ گیا تھا کہ گھر میں بھی پینے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ماں اور شکیلہ کو علم تھا کہ شہزاد پیتا ہے؟ ممتاز کو تلاشی میں کوئی خاص چیز نہیں ملی۔ اس نے شراب کی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرا خیال ہے ان کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ خود انہیں ضائع کر دیجیے گا۔“

حیات نے اطمینان کا سانس لیا اور نہ وہ سوچ رہا تھا کہ شراب کی موجودگی کسی مشکل کا باعث نہ بن جائے۔ مگر ممتاز عام پولیس افسران سے مختلف تھا۔ اگر وہ رشوت لینے والا پولیس افسر ہوتا تو یہ اس کے لیے سنہری موقع ہوتا۔ اسے شہزاد کے کمرے سے ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی جو اس کے قتل پر روشنی ڈال سکتی۔ وہ حیات کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔ ”یہ میرا مو بائل نمبر ہے... ماں جی کی طبیعت جیسے ہی سنبھلے، مجھے کال کر دیجیے گا میں بیان لینے حاضر ہو جاؤں گا۔“

جب حیات کو شہزاد کے قتل کی اطلاع ملی تو اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا اور راستے بھر وہ ماضی کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب شہزاد زندہ تھا۔ پھر یہاں آنے کے بعد وہ تدفین اور ماں بہن کو سنبھالنے میں لگ گیا اس لیے اسے اب تک غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ شہزاد کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مگر ممتاز سے ملاقات کے بعد اسے پہلی بار سوچنے کا موقع ملا۔ شہزاد کے بارے میں نئے انکشافات ہوئے تھے۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اگر اسے اندازہ ہوتا کہ اس کے جانے کے بعد شہزاد اس حد تک بگڑ جائے گا تو وہ شاید باہر نہ جاتا۔ اسے یاد تھا کہ وہ کتنا اچھا اور محنتی طالب علم تھا۔ اس نے میٹرک سے... میں بہترین نمبرز لیے تھے اور اسی وجہ سے اسے اچھے کالج میں داخلہ ملا تھا لیکن جیسے ہی اس کے ہاتھ میں پیسا آیا، اس کی توجہ تعلیم سے ہٹ گئی تھی۔ دولت نے اسے بگاڑ دیا تھا مگر یہ سب قسمت میں تھا اور اس سے مفر ممکن نہیں تھا۔

جیلہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے نیند کی دوا دی گئی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ شکیلہ، حیات کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ کونھی میں کام کرنے کے لیے دو ملازمتیں آتی تھیں لیکن وہ صرف صبح سے شام تک



ہوتی تھیں۔ کوٹھی کا کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ صرف نیچے زمین پر نگرانی کے لیے ایک لڑکا رضوان تھا جسے باغ میں چھوٹی سی کوٹھری بنا کر دے دی گئی تھی اور وہ وہیں رہتا تھا۔ دن میں کوٹھی کے گیٹ پر موجود رہتا اور رات کو کوٹھری میں چلا جاتا۔ اسے تینوں وقت کا کھانا کوٹھی سے مل جاتا تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کا تھا اور کسی چھوٹے سے گاؤں سے آیا تھا۔ یہاں ملازمت کے ساتھ پرائیویٹ میٹرک بھی کر رہا تھا۔ حیات نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اس نے شکلیہ سے پوچھا۔

”یہ کیسا لڑکا ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”شہزاد بھائی کہیں سے لائے تھے۔ یہاں سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اب تک اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی ہے، اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔“

حیات نے شکلیہ کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے، اس لیے خوب سوچ سمجھ کر جواب دینا۔“

شکلیہ ہچکچائی۔ ”جی پوچھیں؟“

”شہزاد کی ان دنوں کیا مصروفیات تھیں؟“

”تین مہینے پہلے تک پھل اتر رہا تھا اس لیے وہ صبح سے شام تک کام کی نگرانی کرتے تھے اور اگر کہیں باہر جاتے بھی تو تھوڑی دیر کے لیے جاتے مگر جب پھل اتر گیا تو شہزاد بھائی اکثر شام کے چار کے آس پاس گھر سے چلے جاتے تھے اور پھر رات بارہ کے قریب واپس آتے۔“

”تمہیں یا امی کو علم تھا کہ وہ کہاں جاتا تھا؟“

”ہم یہی سمجھتے تھے کہ وہ دوستوں کے پاس جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی وہ بتا دیتے تھے کہ کہاں جا رہے ہیں اور اکثر ایسے ہی چلے جاتے تھے۔“

”کبھی ایسا ہوا کہ وہ رات بارہ بجے کے بعد گھر آیا ہو؟“

”بہت کم... اور اگر دیر ہوتی بھی تھی تو دس پندرہ منٹ سے زیادہ کی نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے اس رات جب وہ دو بجے تک نہیں آئے تو میں اور امی دونوں پریشان ہو گئے۔“

حیات، قدیر اور شارق کو جانتا تھا۔ وہ شاہ پور کے رہنے والے تھے لیکن وہ منصور سے ناواقف تھا۔ ”یہ منصور کون ہے؟“

”یہاں سے کچھ آگے مظفر آباد جانے والی سڑک پر منصور کے خاندان کی زمین ہے، وہ وہیں رہتا ہے۔ ان کی

بہت بڑی حویلی ہے۔ منصور کی بہن کی شادی ہوئی تھی تو میں اور امی بھی گئے تھے۔“

”گھر میں شہزاد کیا کرتا تھا؟“

”گھر میں بھائی زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتے تھے اور میوزک سنتے تھے یا کوئی مووی دیکھتے تھے۔“

”کیا تم لوگ کسی وقت بھی اس کے کمرے میں جا سکتے تھے؟“

اس سوال کے جواب پر شکلیہ ہچکچائی لیکن پھر اس نے کہا۔ ”نہیں... وہ دس بجے کے بعد کمرہ اندر سے بند کر لیا کرتے تھے۔ امی نے دو تین بار ان سے پوچھا کہ وہ کمرہ کیوں بند کر لیتے ہیں مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے انداز سے لگتا تھا، انہیں یہ بات پوچھنا اچھا نہیں لگتا ہے۔“

بات واضح تھی۔ شہزاد دس بجے کے بعد کمرہ بند کر کے شراب نوشی کرتا تھا اور اسی لیے وہ کمرہ اندر سے بند کر لیتا تھا تا کہ کوئی اچانک آکر اسے شراب پیتے نہ دیکھ لے۔ امی وجہ سے اس کی نشے کی لت جلیلہ اور شکلیہ پر ظاہر نہیں ہو سکی تھی۔ اگلا سوال حیات نے ہچکچا کر کیا۔ ”کبھی شہزاد نے تم سے کسی لڑکی کا ذکر کیا جسے وہ پسند کرتا ہو؟“

شکلیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”نہیں... شہزاد بھائی نے کبھی ایسا نہیں کیا۔“

”تمہیں یا امی کو کبھی محسوس ہوا کہ وہ کسی سے ملتا ہے یا کسی کو پسند کرتا ہے؟“

شکلیہ نے اس سوال کا بھی نفی میں جواب دیا۔ رات کو جیلہ جاگ گئی تھی اور اس کی حالت بہتر تھی۔ حیات نے اس سے بھی بات کی لیکن جیلہ بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزاد نے نہایت مہارت سے اپنا اصل روپ چھپا رکھا تھا۔ جیلہ اور شکلیہ اسے ایک اچھا بیٹا اور اچھا بھائی سمجھتی تھیں۔ حیات نے محسوس کیا کہ اسے گھر سے کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ اس نے رضوان کو بلا کر اس سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن اسے تو سرے سے کوٹھی کے معاملات کا کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ وہ بلا اجازت اندر نہیں آ سکتا تھا اور اسے تینوں وقت کا کھانا ملازمہ دیتی تھی۔ رضوان صورت سے معصوم اور سادہ سا لڑکا دکھائی دیتا تھا۔ شہزاد کے مرنے کے بعد وہ فکر مند تھا کہ اب نہ جانے اسے ملازمت پر رکھا جاتا ہے یا نہیں۔ حیات نے اسے تسلی دی کہ ابھی وہ میٹریک ہے اور جب تک وہ یہاں ہے اس کی ملازمت برقرار رہے گی۔

دوسرے دن ممتاز نے آکر جیلہ کا بیان لیا۔ رات

حیات نے شہزاد کے کمرے کی بھرپور تلاشی لی تھی اور ایک ایک چیز چیک کی تھی۔ اسے دو ایسی چیزیں ملیں جو اس کے خیال میں کام کی ہو سکتی تھیں۔ اول ایک لڑکی کی تصویر، لڑکی بہت حسین اور دلکش تھی۔ گلابی مائل رنگت اور خوب صورت نقوش کے ساتھ لمبی جیسی تکیجی آنکھیں اسے مزید دلکش بنا رہی تھیں۔ اس نے خاص پوز دے کر تصویر بنوائی تھی اور اپنے شانے کے اوپر سے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ گلابی رخسار پر چند لٹیں تھیں اور نظر آنے والے کان میں موتی کا ٹاپس تھا۔ ہلکے میک اپ اور لباس سے وہ ماڈرن لگ رہی تھی۔ دوسری چیز شہزاد کی ایک اور چیک بک تھی جس سے پچھلے چھ مہینے کے دوران میں تقریباً بیس لاکھ روپے مالیت کے پندرہ چیک کاٹے گئے تھے۔ کٹے ہوئے حصوں پر تفصیل تھی اس لیے حیات کو پتا چل گیا کہ شہزاد نے کتنی مالیت کے چیک دیے ہیں۔ یہ بہت بڑی رقم تھی اور حیات کو نہیں معلوم تھا کہ شہزاد کا کوئی اور بینک اکاؤنٹ بھی ہے کیونکہ اس کے علم میں صرف وہی بینک اکاؤنٹ تھا جس میں وہ باہر سے رقم بھیجتا تھا۔ جب ممتاز نے جیلہ کا بیان لے لیا تو حیات اس کے سامنے رکھ دیں۔ ممتاز گاہ میں لایا اور دونوں چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ ممتاز نے لڑکی کی تصویر دیکھی سے دیکھی۔ ”آپ اسے جانتے ہیں؟“

”نہیں، میں نے پہلی بار اسے دیکھا ہے لیکن میں گزشتہ چھ سال سے باہر ہوں اس لیے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شاہ پور کی کوئی لڑکی ہے یا نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں، اس کی عمر بیس بائیس سے زیادہ نہیں ہے اس لیے یہ اسی عرصے میں بڑی ہوئی ہوگی۔“

ممتاز نے سر ہلایا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن ممکن ہے آپ کی والدہ یا سسر جانتی ہوں۔“

”تب بہتر ہوگا میں آپ کی طرف سے ان سے پوچھ لوں۔“ حیات نے تجویز پیش کی۔ ”میں نہیں چاہتا کہ انہیں شہزاد کے بارے میں پتا چلے۔“

”یہ مناسب ہوگا۔“

حیات تصویر لے کر اندر آیا۔ اس نے جیلہ اور شکلیہ کو تصویر دکھائی تو جیلہ نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے صرف نفی میں سر ہلایا لیکن شکلیہ چونکی تھی، البتہ جب حیات نے اس سے پوچھا تو اس نے بھی نفی میں سر ہلایا۔ یعنی وہ اس تصویر والی لڑکی کو نہیں جانتی تھیں۔ حیات نے انہیں یہی بتایا کہ ڈی ایس پی نے یہ تصویر دی ہے اور وہ بھی نہیں جانتا کہ شہزاد سے اس کا کیا تعلق ہے۔ ممتاز نے حیات کی

رپورٹ سنی اور جانے کے لیے تیار ہو گیا اس نے کہا۔ ”میں یہ چیک بک لے جا رہا ہوں۔ بینک سے معلوم کروں گا کہ چیک کا کیا کیا گیا۔“

اگلے روز سوئم تھا۔ حیات اگرچہ ان رسومات کا قائل نہیں تھا لیکن یہ رسومات ان کے معاشرے کا ایک حصہ تھیں اور ان پر عمل کرنا ہی تھا۔ سوئم میں دور پاس کے سب لوگ شریک تھے۔ یہاں ان کے رشتے دار کم تھے لیکن سارا شاہ پور جانے والا تھا اس لیے تقریباً ہر گھر سے کوئی نہ کوئی فرد آیا تھا۔ آنے والوں میں قدیر، شارق اور منصور بھی شامل تھے۔ حیات، منصور سے پہلی بار ملا تھا۔ وہ شہزاد کی تدفین میں شامل نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی بہن کے پاس کراچی گیا ہوا تھا اور موسم کی خرابی کی وجہ سے دو دن سے کوئی فلائٹ نہیں آ رہی تھی۔ وہ بہ مشکل کوچ کی مدد سے واپس آیا تھا۔ سوئم دوپہر میں تھا۔ اس نے ان تینوں سے کہا۔ ”تم لوگ جانا مت، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سہ پہر تک تمام آنے والے جا چکے تھے۔ حیات اور دوسرے لوگ قبرستان سے بھی ہو آئے۔ شہزاد کے تینوں دوستوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس لیے حیات نے واپسی پر اپنے ساتھ ان کے لیے بھی کھانا لگوا دیا۔ کھانے کے بعد وہ انہیں نشست گاہ میں لے آیا۔ ملازمہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ حیات نے ان سے کہا۔ ”تم لوگ شاید حیران ہو رہے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں روکا ہے؟“

”نہیں۔“ شارق نے جواب دیا۔ وہ شہزاد کا ہم عمر تھا۔ ”میں جانتا ہوں، آپ ہم سے بات کرنا چاہیں گے۔ آج پولیس نے بھی ہم سے بات کی ہے۔“

حیات چونکا۔ ”اچھا... وہ کیا پوچھ رہے تھے؟“

”یہی کہ شہزاد کی کس سے دشمنی ہے اور ان دنوں اس کی مصروفیات کیا تھیں؟“

حیات نے غور سے اسے دیکھا۔ ”تم نے کیا جواب دیا؟“

”کم سے کم میں اس بارے میں نہیں جانتا۔ شہزاد کی بس ہم تینوں سے دوستی تھی اور وہ کسی سے نہیں ملتا تھا اور نہ اس کی کسی سے دشمنی تھی۔“

”کیا ان دنوں وہ کوئی بزنس کر رہا تھا جس میں بڑی رقم کی ضرورت ہو؟“

ان تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر سب نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“



اس بار قدر نے کہا۔

”کسی لڑکی کا چکر؟“

اس بار بھی تینوں نے نفی میں جواب دیا لیکن حیات نے محسوس کر لیا تھا کہ قدر ہچکچا رہا تھا۔ شارق نے کہا۔ ”پولیس نے بھی اس حوالے سے سوال کیا تھا اور ایک لڑکی کی تصویر بھی دکھائی تھی جو ہمارے لیے اجنبی ہے۔“

”شہزاد اس رات یہ کہہ کر نکلا تھا کہ وہ دوستوں کے پاس جا رہا ہے۔ لیکن وہ تمہارے پاس نہیں پہنچا۔“

”یہ درست ہے۔“ قدر نے کہا۔ ”بلکہ اس رات ہمارا کوئی پروگرام بھی نہیں تھا۔“

”میں تو گھر پر بھی نہیں، کراچی میں تھا۔“ منصور بولا۔

”اگر وہ تم لوگوں کے پاس نہیں گیا تو کس کے پاس گیا ہوگا۔۔۔ اس کا کچھ آئیڈیا ہے؟“

اکثر سوالوں کی طرح ان کے پاس اس کا جواب بھی نفی میں تھا۔ کچھ دیر بعد حیات نے محسوس کیا کہ وہ تینوں ہی اس سے کچھ نہ کچھ چھپا رہے تھے۔ اسے خیال آیا کہ وہ انہیں وارننگ دے کہ اگر انہوں نے کوئی جھوٹ بولا ہے تو وہ جلد پکڑا جائے گا لیکن اس نے انہیں پہلے سے ہوشیار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس سے پولیس کی کارروائی میں مشکل پیش آسکتی تھی۔ ان تینوں کو علم نہیں تھا کہ اس نے لاعلمی میں اپنے موبائل میں یہ ساری گفتگو ریکارڈ کر لی تھی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اس گفتگو کو سنا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ان سے الگ الگ بات کرتا تو زیادہ بہتر تھا۔ اس طرح ان کی باتوں میں تضاد آنے کا امکان تھا۔ اس کے لیے یہ بات ناقابل یقین تھی کہ وہ اس کے دوست تھے اور اس کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں تھے۔ وہ یقیناً بہت کچھ جانتے تھے لیکن انجان بن رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد حیات نے ڈی ایس پی ممتاز کو کال کی۔

”مجھے اس تصویر کی ایک کاپی مل سکتی ہے؟“

”بالکل... بلکہ میں نے آپ کے لیے کاپی کرائی ہے۔ کل صبح دفتر جاتے ہوئے آپ کو دیتا جاؤں گا۔“

حیات نے اسے شہزاد کے دوستوں سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنایا۔ ”مجھے شک ہے، وہ بہت کچھ جانتے ہیں لیکن چھپا رہے ہیں۔“

”اتفاق سے یہی شک مجھے بھی ہوا ہے لیکن تینوں ہی بڑے گھرانوں کے لڑکے ہیں اور میں قانون کے دائرے سے ہٹ کر ان سے بات نہیں کر سکتا۔“

”شہزاد کی چیزیں اور گاڑی پولیس کی تحویل میں ہے،

یہ کب تک ملیں گی؟“

”گاڑی ہم نے چیک کر لی ہے۔ آپ کورٹ سے آرڈر لے لیں، ہم ریلیز کر دیں گے اور سامان بھی آپ کے وینڈ اور کر دیا جائے گا۔“

”اس میں تو وقت لگے گا۔“ حیات نے سوچے ہوئے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں پہلے ان چیزوں کو دیکھ سکوں؟“

”بالکل ہو سکتا ہے۔ آپ پولیس اسٹیشن آجائیں، سامان سارا میری تحویل میں ہے۔“

”ٹھیک ہے پھر آپ زحمت نہ کریں، میں کل صبح حاضر ہو جاتا ہوں۔“

اس رات حیات، شہزاد کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بھائی شراب و شہاب کے چکر میں اتنا آگے نکل جائے گا۔ وہ ممتاز سے چیک بک کے بارے میں پوچھنا بھول گیا تھا لیکن وہ کل صبح اس سے معلوم کر سکتا تھا۔ ابھی اسے شہزاد کا ڈیڑھ سٹیفٹ نکلوانا تھا اور اس کے بینک اکاؤنٹ کے بارے میں بات کرنی تھی۔

حیات کا اندازہ تھا کہ اس نے گزشتہ چار سالوں میں ساٹھ لاکھ روپے سے زیادہ رقم بھیجی تھی اور اس کا کم سے کم نصف محفوظ ہونا چاہیے تھا۔ اسے معلوم کرنا تھا کہ شہزاد کے اکاؤنٹ میں کتنی رقم تھی۔ وہ صبح سویرے ناشتا کر کے گھر سے نکلا اور پہلے پولیس اسٹیشن پہنچا۔ ممتاز آچکا تھا۔ اپنے کچھ کام نمٹا کر وہ حیات کو مال خانے میں لایا اور وہ سوٹ کیس اس کے سامنے رکھ دیا جو شہزاد کی گاڑی سے نکلا تھا۔ اس میں درجن بھر قیمتی لیڈیز سوٹ تھے۔ چند ایک عام جوڑے اور رات کے لباس تھے۔ سوٹ کیس کی ایک پاکٹ میں انڈر گارمنٹس بھی تھے۔ مگر نہ تو کوئی جیولری تھی اور نہ ہی کوئی کاغذ یا شناخت کی چیز تھی۔ حیات نے ایک سوٹ اٹھا کر اسے دیکھا۔

اس نے ممتاز سے کہا۔

”یہ کسی دہلی پتلی اور نازک اندام عورت یا لڑکی کا سوٹ ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے بھی نوٹ کیا ہے۔“

”تصویر میں جو لڑکی ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میرا خیال ہے وہ کسی قدر بھاری جسامت کی مالک ہے۔ آپ نے دیکھا اس کے شانے چوڑے اور گداز ڈھلے۔ یہ سوٹ اس کے ناپ کے نہیں ہیں۔ دوسرے اس نے بہت سوبر رنگ پہنے تھے جبکہ یہ سارے شوخ اور بھڑکتے رنگوں

والے کپڑے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سوٹ کیس سے تصویر والی لڑکی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”آپ نے تصویر کی کاپیاں بنوائی ہیں؟“

”ہاں، میں نے بڑی کاپی بنائی ہے۔“ ممتاز نے کہا اور اسے اپنے دفتر میں لے آیا۔ اس نے آٹھ بائی جھ کی تصویر اس کی طرف بڑھائی۔ اصل تصویر چار بائی جھ کی تھی۔ حیات نے سر ہلایا۔

”ہاں، یہ بہتر ہو گئی ہے۔ آپ نے چیکس کے بارے میں معلوم کیا؟“

”نہیں، میں نے بینک منیجر کو کال کر دی تھی۔ آج میں اس سے ملوں گا، دیکھتا ہوں اس نے کیا کیا ہے؟“

”کیا میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟“

”ہاں۔“ ممتاز نے سوچ کر کہا۔ ”لیکن ابھی مجھے کچھ کام ہے۔“

”کوئی بات نہیں، میں انتظار کر لوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”ویسے میں نے شہزاد کے تینوں دوستوں سے کی گئی گفتگو ریکارڈ کر لی ہے۔ اگر آپ سنا چاہیں تو میں سنا سکتا ہوں۔“

”یہ راستے میں سن لیں گے۔“ ممتاز نے تجویز پیش کی۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“

ممتاز نے اس کے لیے چائے منگوائی اور خود فائلیں دیکھنے اور دوسرے کام نمٹانے میں لگ گیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ فارغ ہوا اور حیات کے ساتھ بینک کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے قدر، شارق اور منصور کی حیات سے ہونے والی گفتگو کی ریکارڈنگ سنی لیکن کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ بینک مظفر آباد میں تھا۔ اس کے منیجر نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ ممتاز نے چیکس کا پوچھا۔ منیجر نے شہزاد کے اکاؤنٹ کی اسٹیٹمنٹ نکلائی تھی۔ اس نے اس کی کاپی اس کے سامنے رکھ دی۔ ”یہ پچھلے ایک سال کی مکمل اسٹیٹمنٹ ہے۔ اس میں مسٹر شہزاد احمد کے اکاؤنٹ سے کی جانے والی ہر ٹرانزیکشن موجود ہے۔“

کاپی کئی صفحات پر مشتمل تھی۔ حیرت انگیز طور پر پچھلے ایک سال میں شہزاد کے اس اکاؤنٹ میں بہت بڑی رقمات جمع ہوئی تھیں اور نکالی گئی تھیں۔ ممتاز اسٹیٹمنٹ دیکھ رہا تھا اور حیات کا اکاؤنٹ ذہن خود کار انداز میں حساب کر رہا تھا۔ ایک سال میں شہزاد نے تیس بار چیکس اور اسے ٹائم ٹرانسفر کی مدد سے کوئی اڑتیس لاکھ کی رقم دی تھی جبکہ اس دوران میں

چیکس کی مدد سے کوئی بیالیس لاکھ روپے کی رقم اس کے اکاؤنٹ میں آئی تھی۔ سب سے زیادہ جس فرد کو رقم دی گئی یا اس کے توسط سے آئی، وہ کوئی ارشاد حسین تھا۔ اتفاق سے وہ بھی اسی بینک کا ایک اکاؤنٹ ہولڈر تھا۔ شہزاد نے تقریباً سارا لین دین اسی سے کیا تھا۔ ممتاز نے اس کا پتا اور فون نمبر مانگا۔ منیجر نے معذرت کی۔ ”جناب! یہ بینک کی پالیسی کے خلاف ہے۔ آپ کو عدالت سے آرڈر لانا ہوگا۔“

”اس کے علاوہ کوئی راستہ؟“ ممتاز نے کہا۔ ”یہ ایک قتل کا کیس ہے اور تاخیر سے ممکن ہے قاتل فرار ہو جائے یا کوئی ثبوت مٹا دے۔“

منیجر سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”دیکھیے میرا نام نہ آئے... ارشاد حسین جیولر ہے اور یہاں سے کچھ دور اسی سڑک پر اس کی دکان حسین جیولرز کے نام سے ہے۔ آپ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کا پتا اسٹیٹمنٹ کی مدد سے لگایا ہے۔“

”یہ ہمارا دوسرا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ کا نام نہیں آئے گا۔ کیا میں یہ اسٹیٹمنٹ لے جا سکتا ہوں؟“

”بالکل... ریسرونگ پر سائن کر دیں۔“ منیجر نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ حیات اب تک خاموش تھا۔ جب ممتاز نے سائن کر دیے تو اس نے منیجر سے پوچھا۔

”اس بینک میں شہزاد کا کوئی اور اکاؤنٹ یا کوئی اور چیز ہے؟“

”آپ کون ہیں؟“ منیجر نے کسی قدر کھردرے لہجے میں کہا۔

”میں مرحوم شہزاد احمد کا بڑا بھائی حیات احمد ہوں۔“

حیات نے تعارف کرایا تو اس کا رویہ بدل گیا۔

”سوری! مجھے معلوم نہیں تھا۔ سب سے پہلے میری طرف سے تعزیت قبول کریں۔“ منیجر نے کہا۔ ”جی ہاں، اسی بینک میں شہزاد احمد صاحب نے ایک سیف لاکر بھی لے رکھا ہے۔“

لاکر کا سن کر وہ دونوں چونک گئے۔ ”آپ کا شکر ہے... آپ نے تعاون کر کے ہمارے لیے آسانی کر دی ہے۔“

”مجھے امید ہے، شہزاد صاحب کے قاتل پکڑے جائیں گے۔“ منیجر نے خلوص سے کہا۔ ”شہزاد صاحب کا اکاؤنٹ وارنٹوں کو ٹرانسفر کرنے میں آپ کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔“

”اگر ہم اس کارروائی سے پہلے لا کر دیکھنا چاہیں تو؟“



”اس کے لیے کورٹ آرڈر لازمی ہے۔“ منجھرنے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”یہاں صرف میرے تعاون سے کام نہیں چلے گا۔“

باہر آکر ممتاز نے کہا۔ ”یہ تو مجھے کوئی قانونی لین دین لگ رہا ہے؟“

”وہ کیسے؟“

”غیر قانونی لین دین ہمیشہ نقد ہوتے ہیں، ان میں بینک کو ملوث نہیں کیا جاتا ہے۔“

ممتاز کا اندازہ درست نکلا۔ جب وہ ارشاد حسین سے ملے اور اس نے اقرار کیا کہ شہزاد احمد سے اس کا لین دین ہوتا تھا۔ حسین جیولرز بڑی اور خوب صورت دکان تھی۔ ارشاد کا دفتر پیچھے کی طرف تھا اور فرنٹ پر چار سیلز مین کام کر رہے تھے۔ وہ صرف نگرانی کرتا تھا۔ ممتاز نے پوچھا۔ ”کس سلسلے میں لین دین ہوتا تھا؟“

”شہزاد احمد گولڈ میں سرمایہ کاری کرتا تھا۔“ ارشاد حسین نے محتاط انداز میں کہا۔

”کیا یہ گولڈ ہانڈ ٹائپ کی کوئی چیز ہوتی تھی؟“

حیات نے سوال کیا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”سارا کام نقد اور ہاتھ کے ہاتھ ہوتا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ شہزاد احمد مجھے بینک کا تصدیق شدہ چیک دیتا تھا اور میں اسے گولڈ بار دیتا تھا۔ جب اسے فروخت کرنا ہوتا تھا تو میں اسے تصدیق شدہ چیک دیتا تھا اور وہ گولڈ بار مجھے دے دیتا تھا۔“

ممتاز کی سمجھ میں یہ بزنس نہیں آیا لیکن حیات کا تعلق ایک بزنس فرم سے تھا اور اسے اس بارے میں معلومات بھی تھیں اس لیے وہ سمجھ گیا۔ شہزاد، ارشاد سے اس وقت سونا خرید لیتا تھا جب اس کے خیال میں اس کی قیمت بڑھنے والی ہوتی تھی اور اس وقت فروخت کر دیتا تھا جب اندازاً سونے کی قیمت گرنے والی ہوتی تھی۔ کیونکہ گزشتہ کچھ عرصے میں سونے کی مارکیٹ میں بہت زیادہ اتار چڑھاؤ آرہا تھا۔ حیات کو حیرت ہوئی کہ شہزاد کو اس کام کی سمجھ بوجھ کہاں سے ہوئی تھی۔ یہ خاصا دشوار اور رکی بزنس تھا۔ صرف گولڈ مارکیٹ کو اچھی طرح جاننے والے ہی اس میں کامیاب رہ سکتے تھے۔ حیات کو خیال آیا اور اس نے ممتاز سے لے کر بینک اسٹینٹ کا معائنہ کیا اور ارشاد حسین سے پوچھا۔ ”شہزاد کب سے آپ کے ساتھ یہ بزنس کر رہا تھا؟“

”تقریباً ایک سال سے۔“

”میرا خیال ہے، وہ آپ سے سونا خریدتا اور بیچتا تھا۔“

”یہ درست ہے۔ میں نے اسے کبھی خریدنے یا فروخت کرنے کا مشورہ نہیں دیا۔ صرف شہزاد احمد نہیں، بہت سارے لوگ مجھ سے گولڈ بار لیتے ہیں اور میرے پاس ایک انٹرنیشنل گولڈ فرم کا لائسنس ہے۔ میں اس کا تصدیق شدہ سونا خریدتا اور فروخت کرتا ہوں۔“

ارشاد حسین سے بات کر کے وہ باہر آئے تو حیات نے کہا۔ ”شہزاد کے اکاؤنٹ میں اب بھی بائیس لاکھ روپے موجود ہیں۔ مجھے اس اکاؤنٹ کا علم نہیں تھا۔“

”اس کا کوئی دوسرا اکاؤنٹ بھی ہے؟“ ممتاز چونکا۔

”ہاں، ایک دوسرے بینک میں ہے۔ میں باہر سے جو رقم بھیجتا تھا، وہ اسی اکاؤنٹ میں بھیجتا تھا۔“

ممتاز نے بینک کا پوچھا۔ حیات نے بتایا تو وہ بولا۔

”یہ پاس ہی ہے، اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔“

”میں حیران ہوں۔ شہزاد میں یہ صلاحیت نہیں تھی کہ وہ سونے میں سرمایہ کاری جیسا مشکل کام کرتا۔“

”اس کا مطلب ہے اسے کوئی اور گائیڈ کر رہا تھا۔“ ممتاز نے کہا۔

شہزاد کا دوسرا اکاؤنٹ جس بینک میں تھا، وہ اسی سڑک پر تھا۔ یہ مظفر آباد کا کمرشل علاقہ تھا اور زیادہ تر بینک اسی علاقے میں تھے۔ اس کا منیجر حیات سے واقف تھا کیونکہ چار سال پہلے حیات آیا تھا تو اس سے ملا تھا۔ اس نے پہلے شہزاد کی موت پر تعزیت کی۔ ”مجھے سن کر افسوس ہوا تھا۔“

”قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔“

حیات نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”یہ ڈی ایس پی ممتاز ڈار ہیں، شہزاد کیس کے انویسٹی گیشن آفیسر... یہ آپ سے کچھ پوچھنے آئے ہیں۔“

”ضرور... میں قانون کے ساتھ ہر تعاون کے لیے تیار ہوں۔“ وہ خوش خلقی سے بولا۔

”مجھے شہزاد احمد کی ایک سال کی اسٹینٹ درکار ہے۔“

”اگر آپ آفیشلی درخواست کر رہے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”بالکل، یہ آفیشلی ہے۔“ ممتاز نے جواب دیا۔

منجھرنے دس منٹ میں انہیں شہزاد احمد کے اکاؤنٹ کی ایک سال کی اسٹینٹ منگوادی۔ ممتاز نے اسے دیکھا اور پھر حیات کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے دیکھا اور ایک بار پھر

حیران ہوا۔ اکاؤنٹ میں ساڑھے سینتیس لاکھ روپے تھے۔ یہ رقم اس کے اندازے سے زیادہ تھی۔ جبکہ شہزاد کے اکاؤنٹ میں بھی بائیس لاکھ کی رقم موجود تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے پاس کہیں اور سے بھی رقم آرہی تھی۔ گولڈ کا بزنس تو حیات کے سامنے تھا مگر شہزاد اور بھی کچھ کر رہا تھا تب ہی اس کے دونوں اکاؤنٹس میں بھاری رقم موجود تھی۔ ابھی بینک لا کر دیکھنا باقی تھا کہ اس میں کیا کچھ ہے۔ حیات نے ممتاز سے کہا۔ ”اگر میں عدالت میں وارنٹ کی حیثیت سے... درخواست دوں تو مجھے لا کر کھولنے کی اجازت دیر سے ملے گی لیکن آپ جلدی یہ اجازت حاصل کر سکتے ہیں۔“

”آپ کا خیال ہے کہ لا کر میں کوئی ایسی چیز ہو سکتی ہے جو اس کیس کو حل کرنے میں مدد دے سکتی ہے؟“

”میرا یہی خیال ہے۔“ حیات نے کہا۔ ”درحقیقت میں حیران ہو رہا ہوں۔ پہلے شہزاد کا امیج جیسے میرے سامنے آیا کہ وہ شراب پیتا تھا اور دوسرے نشے بھی کرتا تھا پھر کسی لڑکی کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ ایسے لوگ تو اپنے پاس موجود دولت لٹا دیتے ہیں مگر اب پتا چل رہا ہے کہ وہ کما رہا تھا۔ ایک بزنس تو آپ نے دیکھ لیا مگر اس کے بینک اکاؤنٹس میں موجود رقم دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے کہ وہ کوئی کام اور بھی کر رہا تھا۔ پھر اس نے زمین کو بہت اچھے طریقے سے سنبھال رکھا تھا۔ اب اس پر بہترین پھل دینے والے درخت لگے ہیں۔ میں شاید وضاحت نہیں کر پا رہا ہوں اپنی بات کی۔“

”مسٹر حیات! آپ کا مطلب ہے اس کے دونوں کردار آپس میں منبج نہیں کر رہے ہیں۔“

”بالکل۔“ حیات نے جوش سے کہا۔ ”اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ لا کر کھول کر دیکھا جائے کہ اس میں کیا ہے۔“

”میں کل اجازت لینے کی کوشش کرتا ہوں لیکن آپ کو میرے ساتھ کورٹ میں پیش ہونا پڑے گا شہزاد کے وارنٹ کی حیثیت سے۔“

”میں آجاؤں گا۔“ حیات نے جواب دیا۔ ممتاز اسے واپس پولیس اسٹیشن لے آیا جہاں اس کی کار موجود تھی۔

”آپ کب تک ہیں یہاں؟“

”کم سے کم دو مہینے تک تو ہوں۔ اتنی چھٹی ہے میرے پاس۔“ اس نے جواب دیا اور شاہ پور کے لیے روانہ ہو گیا مگر گھر جانے کے بجائے وہ قدیر کے گھر پہنچ گیا۔ قدیر اتفاق سے گھر پر تھا۔ حیات اندر نہیں گیا بلکہ اسے باہر بلا لیا۔

”جی حیات بھائی؟“

”میرے ساتھ آؤ... تمہارا کچھ وقت لوں گا۔“

زرگذیدہ وہ اس کے ساتھ آ بیٹھا اور حیات نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ قدیر کا گھر شاہ پور میں ہائی وے کی مغربی طرف واقع پہاڑی پر تھا۔ حیات کا گھر مشرقی سمت میں تھا۔ وہ کار نیچے لے آیا۔ یہاں چند اچھے ریسٹوران اور ہوٹل تھے۔ اس نے کار ایک ریسٹوران کے سامنے روکی۔ ایک کونے کی میز منتخب کر کے حیات نے چائے کا آرڈر دیا اور قدیر کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نروس لگ رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے تم نے پوری بات نہیں بتائی تھی۔“

”میں نے آپ کو سب بتا دیا تھا۔“ قدیر نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ حیات نے جیکٹ سے لڑکی کی تصویر نکال کر اس کے سامنے کی۔

”سب نہیں بتایا تھا، تم نے اس کے بارے میں چھپایا ہے۔“

”میں سچ کہہ...“

”دیکھو بیٹے۔“ حیات نے اس کی بات کاٹ کر نرمی سے کہا۔ ”دوست کا راز رکھنا اچھی بات ہے لیکن یہ معاملہ مختلف ہے۔ شہزاد اب زندہ نہیں ہے۔ کسی نے اسے بید روی سے قتل کر دیا ہے اور اس کا قاتل آزاد گھوم رہا ہے۔ اس کی گاڑی جائے واردات سے دو کلومیٹر دور کھڑی پائی گئی اور اس میں ایک سوٹ کیس تھا جس میں کسی لڑکی یا عورت کے کپڑے بھرے ہوئے ہیں۔ تم اس کے دوست ہو اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ تم اس بارے میں کچھ نہ جانتے ہو۔“

”میں سچ کہہ...“

”وہ شراب پیتا تھا... شاید کوئی اور نشہ بھی کرتا تھا۔“

حیات نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔ قدیر ہراساں نظر آنے لگا۔ ”تم جانتے ہو؟“

اس بار اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہوں لیکن اس نے بھی ہمارے سامنے نہیں پی۔“

”تمہارا مطلب ہے تم چاروں میں صرف شہزاد پیتا تھا؟“

”نہیں لیکن میں اور شارق نہیں پیتے۔“

”گویا منصور پیتا ہے؟“ حیات نے نتیجہ اخذ کیا۔ ”یہ الگ بات ہے۔ مجھے یہ جانا ہے کہ شہزاد کس لڑکی کے چکر میں تھا؟“

”میں خدا کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس بارے میں نہیں معلوم اور نہ میں نے اس لڑکی کو پہلے دیکھا ہے۔“

”تم کچھ نہ کچھ جانتے ہو۔“ حیات دباؤ برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ لڑکا کم عمر تھا وہ ٹوٹ سکتا تھا، اس کا اندازہ



درست ثابت ہوا۔ بالآخر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔  
 ”میں نے صرف ایک بات سنی ہے۔ مگر صرف سنی ہے، یقین سے نہیں کہہ سکتا ہوں۔“  
 ”کیا بات ہے؟“

”شہزاد شاید جینا ہاؤس جاتا تھا۔“

”جینا ہاؤس...؟ یہ کہاں ہے؟“

”منظر آباد والی سڑک پر ہے۔ شہر سے کچھ پہلے دائیں طرف ٹیلے پر سرخ چھت والی بڑی سی کوٹھی ہے۔ اس کا مالک برطانیہ گیا تھا۔ اس نے وہاں جینا نامی گوری سے شادی کی۔ بعد میں وہ مر گیا تو جینا یہاں آگئی اور اس نے کوٹھی میں لڑکیوں اور عورتوں کے لیے ہاسٹل کھول لیا لیکن وہاں پر...“  
 یہ کہتے ہوئے قدیر کی نظریں جھک گئی تھیں۔ حیات سمجھ گیا۔  
 ”ہاسٹل یا قحبہ خانہ؟“

”وہی۔“ قدیر نے سر ہلایا۔ ”جینا اسے چلاتی ہے اور وہاں صرف بہت دولت مند اور بڑے لوگ جا سکتے ہیں۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ شہزاد وہاں جاتا تھا؟“

”ایک دن شہزاد ہمارے ساتھ تھا کہ اسے کسی کی کال آئی اور اس کے موبائل کا اسپیکر کھلا ہوا تھا۔ میں اس کے بالکل پاس بیٹھا تھا۔ شہزاد نے فوراً اسپیکر بند کر دیا لیکن اس سے پہلے میں نے کسی لڑکی کو کہتے سنا کہ تم جینا ہاؤس کب آؤ گے؟ اس وقت شہزاد کے تاثرات بھی عجیب تھے۔ اس نے چور نظروں سے مجھے دیکھا کہ میں نے کچھ سنا تو نہیں ہے۔ میں بھی انجان بن گیا۔“

”تمہاری اس موضوع پر شہزاد سے بات نہیں ہوئی؟“

”نہیں... ویسے بھی ان دنوں وہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ بس ایسا لگتا تھا جیسے ڈیوٹی نبھانے آیا ہو۔“  
 ”اس کا تم تینوں میں سے کسی سے جھگڑا یا تلخ کلامی ہوئی؟“

”بہت زیادہ تو نہیں لیکن منصور سے وہ کچھ کھچا سا تھا۔ البتہ میں نے اسے کسی سے جھگڑتے یا تلخ کلامی کرتے نہیں دیکھا۔“

”کچھ اندازہ ہے کہ منصور اور اس کے درمیان کیا چکر چل رہا تھا؟“

قدیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے، شاید دو مہینے پہلے کی بات ہے پھر ہمارا ملنا جلنا کم ہو گیا۔“

شہزاد اس واقعے سے پہلے آخری بار کوئی دو ہفتے پہلے ہم سے ملا تھا۔ یعنی ہم چاروں ایک ساتھ جمع ہوئے تھے۔ اس کے بعد کم سے کم میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اگر کسی اور سے ملا ہو تو مجھے اس کا پتا نہیں ہے۔“

حیات کو یقین تھا کہ اب قدیر سچ کہہ رہا۔ اب اسے ایک سرا ملا تھا۔ شہزاد کی جیب میں لڑکی کا سوٹ کیس موجود تھا اور اب اس کا تعلق ایک بدنام جگہ سے بھی نکل آیا تھا۔ قدیر کے پاس سے وہ دوبارہ شہر کی طرف روانہ ہوا اور اس بار وہ جینا ہاؤس دیکھنا چاہتا تھا۔ جینا ہاؤس بہت بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی کوٹھی تھی۔ اس کی چھت کا طرز تعمیر چینی تھا اور سرخ کھریل کی چھت تہ در تہ اوپر سے نیچے آرہی تھی۔ حیات کچھ دیر اس کے سامنے رک کر اس کا جائزہ لیتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ چند منٹ بعد اسے ایک ہوٹل دکھائی دیا۔ لُنج کا وقت ہو رہا تھا، اس نے گاڑی اس طرف موڑ دی۔ اندر آ کر اس نے ایک کونے کی میز منتخب کی۔ ابھی زیادہ رش نہیں تھا۔ ایک نوجوان ویٹر اس کے پاس آیا اور مینیو اس کے سامنے رکھ دیا۔ حیات نے کہا۔

”سوپ لے آؤ۔“

کچھ دیر میں ویٹر سوپ لے آیا تو حیات نے اسے سوکا ایک نوٹ دیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ ”اور کوئی خدمت جناب؟“  
 ”نہیں، ابھی میں سوپ لوں گا، لُنج کچھ دیر بعد کروں گا۔“ حیات نے جواب دیا۔ ”تم یہاں پرانے آدمی ہو؟“  
 ”جی سر! میں تین سال سے کام کر رہا ہوں۔“ ویٹر نے جواب دیا۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا اور جانتا تھا کہ اسے کسی مقصد کے تحت ہی یہ پیشگی ٹپ دی گئی ہے۔ حیات سوپ پینے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

”میں بہت عرصے بعد یہاں آیا ہوں۔“

”آپ کہیں باہر ہوتے ہیں سر؟“

”انگلینڈ... میں کسی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔“

”کس کی تلاش میں سر؟“

”وہ یہیں کہیں رہتی ہے، شاید تم نے اسے دیکھا ہو؟“

ویٹر چونکا۔ ”وہ کوئی خاتون ہے؟“

”ہاں...“ حیات نے کہا اور تصویر نکال کر اس کے سامنے کر دی۔ ساتھ ہی وہ غور سے ویٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ ویٹر کوئی رد عمل ظاہر کرتا، اس نے پرس نکال لیا اور اس سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکالا۔ اس کا خاطر خواہ رد عمل ہوا۔ ویٹر نے سر ہلایا۔

”جی سر! میں نے ان خاتون کو دیکھا ہے۔“



حیات کا دل دھڑک اٹھا۔ ”کہاں... کس کے ساتھ؟“

”ایک لڑکا جیسا تھا۔ یہ دو تین بار اس کے ساتھ آئی تھی۔ میں نے ہی سو دیکھا تھا اس لیے مجھے یاد رہ گیا۔“

”تو جوان کا حلیہ یاد ہے؟“

جواب میں ویٹر خاموش کھڑا رہا تو حیات نے نوٹ اس کے سامنے رکھ دیا مگر چھوڑا نہیں۔ ویٹر بولا۔ ”عمر بیس بائیس سال تھی۔ تنیکے سے نقوش تھے، سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں...“ وہ شہزاد کا حلیہ بتا رہا تھا۔ اتفاق سے حیات کے پرس میں اس کی اور شہزاد کی ایک مشترکہ تصویر موجود تھی۔ اس نے وہ تصویر نکال کر ویٹر کے سامنے کی اپنے چہرے پر اٹکھڑا رکھ لیا۔

”یہی ہے؟“

”بالکل یہی ہے۔“ ویٹر نے بے ساختہ کہا تو حیات نے نوٹ اس کی طرف بڑھادیا۔

”تم اس سے ڈبل کما سکتے ہو اگر مجھے بتا دو کہ یہ لڑکی کہاں ملے گی۔“

”سر! میں غریب آدمی ہوں۔“ ویٹر نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ غریب آدمی کہیں پھنس جائے تو اس کی جان نہیں بچتی۔“

”فکر مت کرو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا اور نہ کہیں تمہارا نام لیا جائے گا۔“ حیات نے کہا اور ہزار کا نوٹ بھی نکال لیا۔

”میں یہ بھی دوں گا اور تمہارا شکر گزار ہوں گا۔“

ویٹر ابھی تک ہچکچا رہا تھا۔ ”سر! خطرے کی بات تو نہیں ہے؟“

”نہیں... اور میں کہہ چکا ہوں کہ تمہارا نام نہیں آئے گا۔ بس مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ کہاں رہتی ہے۔“

”یہ جینا ہاؤس کی لڑکی ہے۔“ ویٹر نے سرگوشی میں کہا۔

”جینا ہاؤس کہاں ہے... یہاں کون رہتا ہے؟“

حیات نے انجان بن کر کہا۔ ویٹر اسے خود بھی یہی خیال آ رہا تھا کہ تصویر والی لڑکی کا تعلق جینا ہاؤس سے ہے۔

”جی میں کیا بتاؤں، سمجھ لیں بہت بری جگہ ہے۔ وہاں رہنے والی عورتیں اچھا کام نہیں کرتیں۔“

”تمہارا مطلب ہے وہ جسم فروش ہیں؟“ حیات نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

”جی سرا“ ویٹر نے کہا۔ ”لیکن وہ خطرناک لوگ ہیں۔ سب ان سے ڈرتے ہیں کیونکہ بڑے سرکاری افسران

ان کے ساتھ ہیں۔ کوئی رپورٹ کراتا ہے تو خود اندر ہو جاتا ہے۔ جینا نے بد معاش یا لے ہوئے ہیں جو اس کے ایک اشارے پر کسی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ پاؤں توڑ سکتے ہیں یا اسے مار بھی سکتے ہیں۔“

”مار بھی سکتے ہیں۔“ حیات نے زیر لب کہا۔ ویٹر چلا گیا۔ سوپ کے کچھ دیر بعد اس نے لچ منگوایا۔ کھانے کے دوران میں وہ سوچتا رہا کہ اب اس معاملے میں کیا کرے۔ کیا وہ ممتاز کو سب بتائے؟ لیکن اس سے کیا ثابت ہوگا؟ اگر تصویر والی لڑکی نے شہزاد کے ساتھ دو تین بار یہاں کھانا کھا لیا۔ پھر ویٹر کے بیان کے مطابق جینا ہاؤس والے بہت طاقتور اور بارسوخ تھے۔ ایک ڈی ایس پی اگر چاہتا بھی تو ان کے خلاف کیا کر سکتا تھا؟ حیات اچھی طرح جانتا تھا کہ یہاں پولیس، انتظامیہ کی غلام ہے اور انتظامیہ پیسے کی غلام ہے۔ ان سے یہ توقع محال تھی کہ وہ جینا ہاؤس تک نفیث کا دائرہ لے جاتے مگر کیا وہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو ایسے ہی چھوڑ دے گا؟ یہ خیال اس کے لیے سخت اذیت ناک تھا۔

☆☆☆

رات بارہ بجے سردی شدت کی تھی۔ درجہ حرارت یقیناً منفی سے کہیں نیچے گر گیا تھا۔ حیات ایک اونچی چٹان پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر دوورین لگی تھی جو تقریباً تین سو گز دور جینا ہاؤس پر مرکوز تھی۔ یہاں سے عمارت بہت اچھی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ کوٹھی کے پورچ میں اور اندرونی چار دیواری کے ساتھ کم سے کم درجن بھر لکڑی گاڑیاں موجود تھیں۔ اس سردی کے عالم میں بھی اچھے خاصے لوگ آئے ہوئے تھے۔ حیات گزشتہ دو گھنٹے سے اس چٹان پر موجود تھا جو کوٹھی والے نیلے کے مخالف سمت میں تھی۔ یہ جگہ کوٹھی سے کم سے کم دو سو فٹ بلند تھی اس لیے یہاں سے کوٹھی کا منظر بہت واضح دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اس چٹان تک پہنچنا بڑا مشکل ثابت ہوا تھا۔ کئی بار وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ سردی سے بچاؤ کے لیے اس نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر ٹوپی اور ہاتھوں میں چمڑے کے دستانے بھی تھے۔ اس کے باوجود وہ ٹھنڈا رہا تھا۔ سچ بستی چٹان پر لیٹنا بھی کم مشکل نہیں تھا۔

ان دو گھنٹوں کے دوران میں چھ سات گاڑیاں کوٹھی کے اندر گئی تھیں اور ان سے اوپری طبقے کے لوگ اتر کر کوٹھی کے اندر گئے تھے۔ ان کا جس طرح سے استقبال ہوا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ وہ یہاں کے پرانے گاہک ہیں۔ کوٹھی کے احاطے میں کئی سرح افراد ٹہلتے دکھائی دے رہے تھے۔

گاڑیوں کے ساتھ آنے والے ڈرائیور گاڑیوں میں رکے ہوئے تھے۔ یعنی ان کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے وہ گاڑیوں میں گھسے ہوئے تھے۔ حیات وقفے وقفے سے کوٹھی کا معائنہ کر رہا تھا جو تیز روشنیوں کی وجہ سے بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ اس کی چار دیواری پر تیز روشنی والی لائٹس لگی تھیں اور اندر کا ایک ایک گوشہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ کھڑکیاں ساری ہی بند اور تاریک تھیں مگر یہ تاریکی یقیناً بھاری پردوں کی وجہ سے تھی۔ اس موسم میں اور اندر جاری سرگرمیوں کے ہوتے ہوئے کھڑکیاں کھلی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

حیات سوچ رہا تھا کہ اب یہاں سے چلنا چاہیے کیونکہ سردی شدید تھی۔ اس نے اٹھنے سے پہلے ایک بار پھر پوری کوٹھی کا معائنہ کیا۔ وہ دوورین سے کھڑکیاں کھنگال رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر ایک کھڑکی کھلی اور اس سے کسی عورت نے باہر جھانکا۔ یہ اوپری منزل کی کھڑکی تھی اور عورت آگے جھکی ہوئی تھی، اس لیے حیات اس کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس موسم میں عورت کو کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ عورت نے سویٹر پہن رکھا تھا لیکن اس کے بال کھلے ہوئے تھے پھر اس نے چہرہ اوپر کیا تو حیات چونک گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کی تصویر اس کے پاس تھی اور جو شہزاد کے ساتھ ہوٹل میں جاتی رہی تھی۔ اس نے جلدی سے دوورین فوکس کی اور اب عورت یا لڑکی کا چہرہ بالکل اس کے سامنے تھا۔ یہ وہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت اس کے چہرے پر حزن و ملال کے تاثرات تھے۔ شاید مسلسل رونے سے آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

حیات کا خیال تھا کہ شاید اس نے گھٹن کی وجہ سے کھڑکی کھولی ہے لیکن جب اس نے ایک بیگ اٹھا کر کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھا اور پھر خود بھی چوکھٹ پر آئی تو حیات چونکا۔ کیا وہ یہاں سے بھاگ رہی تھی؟ اس خطرناک ترچھی چھت پر اترنے کا اور کیا مطلب ہو سکتا تھا اور وہ بھی رات کے اس پہر۔ لڑکی نے بیگ اٹھا کر پشت پر اسکول بیگ کی طرح لٹکالیا اور احتیاط سے بیچ کر چھت کے کنارے کی طرف سرکنے لگی۔ حیات بہت توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سیاہ سویٹر کے ساتھ سیاہ ہی رنگ کی چست پتلون اور ہم رنگ جوتے پہن رکھے تھے۔ وہ بلاشبہ بہت دلکش جسم کی مالک تھی۔ نیچے سرکنے سے پہلے اس نے اپنے بال سیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھ لیے تھے۔ وہ سرگتی ہوئی کنارے تک آئی اور دوسری چھت پر اتری۔ وہ اب بھی زمین سے کوئی بیس فٹ کی بلندی

پر تھی اور ایک چھت اور تھی۔ وہ اس پر اتر کر ہی زمین تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ بہت سنبھل کر اور آہستگی سے حرکت کر رہی تھی۔ بالآخر اس نے تیسری چھت بھی عبور کر لی اور اب کنارے پر ٹپٹی تھی۔ اس نے نیچے دیکھا کہ وہاں کوئی پہرے دار تو نہیں لیکن اس سمت کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ حیات نے چند لمحے کے لیے دوورین اس سے ہٹا کر اس طرف کا جائزہ لیا اور دوبارہ دوورین لڑکی پر مرکوز کر دی۔ وہ جس طرح سے یہاں تک آئی تھی، لگ رہا تھا کہ وہ جرأت مند ہے ورنہ اس خطرناک چھت پر مرد بھی قدم رکھتے ہوئے ڈرتے۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس طرف کوئی نہیں ہے تو اس نے پاؤں نیچے لٹکائے اور چھت کا کنارہ تھام کر آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگی۔ کچھ دیر میں وہ ہاتھوں کے بل لنگ رہی تھی اور زمین سے اس کے پیروں سے تین فٹ نیچے تھی۔ اس نے ہاتھ چھوڑا اور اسی لمحے اس سمت ایک پہرے دار نمودار ہوا لیکن اس کی نظریں کسی اور سمت تھیں اس لیے وہ لڑکی کا ہیولہ نہیں دیکھ سکا اور وہ گرتے ہی جلدی سے کیاری کے پودوں کے درمیان دبک گئی۔ پہرے دار ٹھٹھا ہوا اس کے نزدیک سے گزرتا چلا گیا۔ اس نے غور نہیں کیا ورنہ وہاں اتنی روشنی تھی کہ لڑکی دکھائی دے جاتی۔ اس کی قسمت اچھی تھی۔

یہ تو واضح تھا کہ لڑکی چوری چھپے جینا ہاؤس سے نکلنے کی تیاری کر رہی ہے۔ شاید وہ یہاں کے ماحول سے بدظن ہو گئی تھی۔ وہ شہزاد سے ملتی تھی اور شاید ان کے درمیان کوئی مفاہمت ہو گئی تھی اور شاید اس رات اس نے شہزاد کے ساتھ فرار کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ سوٹ کیس کس کا تھا؟ کیونکہ اس میں جو کپڑے تھے وہ اس کی جسامت کے نہیں تھے۔ اب حیات واضح دیکھ سکتا تھا کہ وہ بھرے بدن کی مالک ہے۔ جیسے ہی پہرے دار وہاں سے گزرا، وہ تیز قدموں سے چار دیواری کی طرف جانے لگی۔ پہرے داروں کی نظر سے بچنے کے لیے وہ لان میں لگے چھوٹے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر دیوار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اچانک حیات کو خیال آیا اور وہ کھڑا ہو گیا اور تیزی سے چٹان سے اترنے لگا۔ وہ اتنی غلٹ میں تھا کہ کئی بار نیچے گرتے گرتے بچا۔ جیسے تیسے وہ نیچے اس جگہ پہنچا جہاں اس نے گاڑی کھڑی کی تھی۔ اسے اسٹارٹ کر کے وہ سڑک کی طرف لایا اور جینا ہاؤس سے آنے والے راستے سے کچھ دور کچے میں رک گیا۔ یہاں درختوں تلے اندھیرا تھا۔ اگر کوئی پاس آتا تب ہی گاڑی دیکھ سکتا تھا۔ کار کا رنگ بھی گرے تھا جو اندھیرے میں مشکل سے دکھائی دیتا۔



حیات بروقت پہنچا تھا کیونکہ کچھ دیر بعد اوپر سے ایک سایہ نمودار ہوا اور پیدل ہی سڑک پر مظفر آباد کی طرف چل پڑا۔ حیات نے ساخت سے جان لیا کہ وہ لڑکی تھی۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور اس کے پیچھے آیا۔ روشنی دیکھ کر وہ چونکی اور جلدی سے سڑک سے ہٹ گئی۔ حیات نے اس کے پاس کار روک دی۔ ”آپ مظفر آباد جا رہی ہیں؟“

”ہاں لیکن میں چلی جاؤں گی۔“ وہ بولی۔ اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

”سردی ہے اور سڑک بھی ویران ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں لفٹ دے سکتا ہوں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔“ وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ حیات کا خیال تھا کہ وہ انکار کر دے گی لیکن خلاف توقع وہ پلٹ آئی۔ اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور لڑکی اندر آ گئی۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے حیات نے دیکھا، اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ اس نے کار آگے بڑھا دی۔ اندر ہیئر آن تھا۔ چند لمحوں میں لڑکی بہتر محسوس کرنے لگی۔ ”شکریہ! باہر بہت سردی ہے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ حیات نے کہا۔

”آپ کہیں پاس سے سڑک پر آئے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔ حیات اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ کار کی روشنی اچانک ہی پیچھے سے آئی تھی۔ اگر حیات ہائی وے پر دور سے آتا تو وہ پہلے روشنی محسوس کر لیتی جبکہ ایسا نہیں تھا۔

”اگر میں کہوں کہ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا؟“

”تو میں مان لوں گی۔“ لڑکی نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور تب حیات نے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سے پستول کی جھلک دیکھی۔ ”مجھے بھی یہی شبہ تھا۔ اب بتاؤ تم کیوں میرا انتظار کر رہے تھے؟“

”میں بتا دوں گا۔۔۔ پستول رکھ لو، اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ وہ بولی اور پستول حیات کے پہلو سے لگا دیا۔ ”یقین کرو، مجھے گولی چلانے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوگا۔“

”میں نے کہا نا، جلد بازی مت کرو۔ میں دشمن نہیں ہوں بلکہ شاید دوست ہوں۔“

”شاید۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”ہاں، ابھی ہم دونوں کے درمیان گفتگو ہوگی اور اس کے بعد صورت حال واضح ہو جائے گی۔“

”کیسی صورت حال؟“

”یہ بتاؤ کہ تم جینا ہاؤس سے اس طرح کیوں نکلیں؟“

”تو میرا شبہ درست تھا۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جنہوں نے شہزاد کو قتل کیا تھا۔“ اس نے حیات کے پہلو پر دباؤ بڑھا دیا۔

”نہیں، میں خود شہزاد کے قاتل یا قاتلوں کی تلاش میں ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ”تم ہو کون... پولیس یا خفیہ پولیس والے ہو؟“

”میں جو کوئی بھی ہوں لیکن تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں اور نہ میرا تعلق کسی ایسے شخص سے ہے جو شہزاد کے قتل میں ملوث ہو۔ ویسے میں یہی شبہ تم پر کر سکتا ہوں۔“

وہ چونکی۔ ”کیا... تم شہزاد کے قتل کی بات کر رہے ہو؟“

”بالکل... پولیس کو شہزاد کی گاڑی سے ایک سوٹ کیس ملا ہے جس میں زنا نہ ملبوسات تھے۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ حیرت سے بولی۔ ”تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں، وہ سوٹ کیس پولیس کی تحویل میں ہے لیکن اس سے کوئی ایسا نشان یا پتا نہیں ملا جس سے پتا چلے کہ وہ کس کا ہے؟“

”تم کون ہو اور تمہیں یہ سب کیسے معلوم؟“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا اور شہزاد کا آپس میں کیا تعلق تھا؟ معاشرتی لحاظ سے تم دونوں کا کوئی تعلق نہیں بنتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تمہارا تعلق جینا ہاؤس سے ہے اور سب جانتے ہیں وہاں کیا ہوتا ہے۔ شہزاد ایک عام گھرانے کا فرد تھا اور اب وہ دنیا میں نہیں رہا ہے۔“

”میرا اس سے کیا تعلق تھا؟“ لڑکی کی آواز لرزنے لگی پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا پستول والا ہاتھ حیات کے پہلو سے ہٹ گیا اور وہ چاہتا تو آرام سے اس سے پستول چھین سکتا تھا لیکن اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ البتہ کار ایک طرف کر کے روک لی۔ لڑکی نے چونک کر دیکھا۔ ”یہاں کیوں رکے ہو؟“

حیات نے کہا۔ ”میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔“ اس نے پستول دوبارہ حیات پر تان لیا۔ حیات نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

”تم شہزاد سے محبت کرتی تھیں؟“

”ہاں، میں اس سے محبت کرتی تھی اور اس سے شادی کرنے والی تھی۔“ وہ تند لہجے میں بولی۔ ”میں اس زندگی سے تنگ آ گئی تھی جس میں مجھے نت نئے مردوں سے واسطہ پڑتا تھا۔“

”تم دونوں نے فرار کا پروگرام بنایا لیکن پکڑے گئے اور ان لوگوں نے شہزاد کو... مار دیا۔“

”میرے ساتھ فرار؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”نہیں... ابھی تو ہم سوچ رہے تھے۔ شہزاد ایک ہفتے سے میرے پاس نہیں آیا اور پھر اس کی... لڑکی کی آواز بھرا گئی۔

”تم اس سے باہر ملتی تھیں... کیا تمہیں باہر جانے کی اجازت تھی؟“

”ہاں، شہزاد اب جانا پہنچانا ہو گیا تھا اس لیے مجھے اس کے ساتھ جانے کی اجازت مل سنی تھی۔ لیکن تم کون ہو اور یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اس لیے میں کہیں بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”فکر مت کرو، میں تمہیں شہزاد کے گھر لے جاؤں گا۔“

”شہزاد کے گھر؟“ وہ دنگ رہ گئی۔ ”تم کون ہو؟“

”شہزاد کا بڑا بھائی حیات۔“

☆☆☆

وہ لباس بدل کر نشست گاہ میں آ گئی۔ شکلیہ نے جائے تیار کر لی تھی۔ وہ تجسس تھی کہ بھائی اتنی رات گئے اس لڑکی کو کیوں لایا ہے لیکن حیات نے اسے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ بادل ناخواستہ وہاں سے چلی گئی۔ لڑکی کا نام سوہانہ تھا اور اس کا تعلق آزاد کشمیر سے ہی تھا۔ حیات نے اس سے کہا۔

”اب تم بتا سکتی ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے؟“

”پہلے آپ بتائیے کہ آپ مجھ تک کیسے پہنچے؟“ سوہانہ اب اس سے احترام سے بات کر رہی تھی۔

”شہزاد کے پاس تمہاری ایک تصویر نکلی تھی۔ وہ تصویر پولیس کے پاس بھی ہے اور وہ بھی تمہیں تلاش کر رہی ہے۔

میں نے اسی تصویر کی مدد سے تمہیں تلاش کیا۔“

”آپ اس وقت وہاں کیا کر رہے تھے؟“

”یہ بالکل اتفاق تھا۔۔۔ میں دور بین سے جینا ہاؤس کا جائزہ لے رہا تھا کہ میں نے تمہیں خاموشی سے نکلتے دیکھا اور پھر میں سڑک پر تمہارا انتظار کرنے لگا۔“

”اوہ۔“ سوہانہ نے گہری سانس لی۔

سوہانہ کا تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں سے تھا۔ وہ بچپن سے بہت خوب صورت تھی۔ وہ غریب لوگ تھے۔

باپ نشہ کرتا تھا اور ماں محنت کر کے گھر چلاتی تھی۔ وہ سترہ برس کی ہوئی تو ایک دن اس کا باپ اسے گاؤں سے یہاں شہر لے آیا۔ وہ دھوکا دے کر لایا تھا کہ اسے شہر دکھائے گا۔

سوہانہ نے مڈل تک اسکول میں پڑھا تھا اور اسے گاؤں سے باہر کی دنیا کے بارے میں پتا تھا مگر باپ اسے جینا ہاؤس لے آیا۔ کوٹھی اور اس کی شان و شوکت دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ بے اختیار اس کے دل میں خواہش ابھری کہ کاش وہ اس کوٹھی میں رہ سکے۔ اس کی خواہش یوں پوری ہوئی کہ اس رات وہ کوٹھی میں رہی اور اگلی صبح جاگ کر اسے پتا چلا کہ اس کا باپ اس کا سودا کر کے چاچا ہے۔ سوہانہ تڑپ گئی۔

اس نے بہت رونا دھونا کیا اور جینا سے التجا کی کہ اسے واپس جانے دیا جائے، اس کی ماں اس کے بغیر مر جائے گی مگر جینا نے اسے بتایا کہ اسے یہیں رہنا ہے اور یہ بھی بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ سوہانہ کو جوش آ گیا۔

”میں آبرو نہیں بچ سکتی... تم بے شک مجھے مار دو۔“

”میری بچی! میں تمہیں ماروں گی نہیں اور نہ زبردستی کروں گی۔“ جینا نے بہترین اردو میں کہا۔ ”جلد تم خود میری ہر بات مانو گی۔“

سوہانہ کا خیال تھا کہ اسے زبردستی پامال کر کے اس کام پر لگایا جائے گا لیکن اس وقت اس کی حیرت کی حد نہ رہی جب جینا نے اس کی مزید تعلیم اور تربیت کے لیے استاد مقرر کیے۔ وہ کتابوں، تصویروں اور ویڈیوز کی مدد سے پڑھاتے تھے۔ اس کا دیہاتی لہجہ درست کرتے تھے۔ اسے جدید لباس دیے گئے اور انہیں پہننے کا سلیقہ سکھایا۔ ساتھ ہی غیر محسوس انداز میں اس کے کچے ذہن کو بے راہ روی اور جنس کی طرف موڑا گیا۔ وہاں رہنے والی لڑکیاں اسے اپنے تجربات اس طرح سناتیں کہ وہ سنسنی محسوس کے بغیر نہیں رہتی تھی۔ یہی سبھی کسر فلموں کی مدد سے پوری کی گئی۔ جینا اپنی لڑکیوں کو بہت پالش کر کے رکھتی تھی۔ وہ ان کی ذہنی اور جسمانی صحت کا پورا خیال رکھتی تھی۔ اس کا اصول تھا کہ کسی لڑکی کو ہفتے میں تین دن سے زیادہ کام پر مجبور نہیں کرتی تھی، ہاں وہ خود کرنا چاہے تو اسے اجازت ہوتی تھی۔ ان کا باقاعدگی سے طبی معائنہ ہوتا تھا کہ انہیں کوئی مسئلہ یا بیماری تو لاحق نہیں ہوگئی ہے۔

ایک سال بعد سوہانہ بغیر جبر کے مادام جینا کی آلہ کار بننے پر راضی ہو گئی۔ ایک سال کے دوران میں کسی نے اسے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جاسوسی ڈائجسٹ 274 جنوری 2013ء

جاسوسی ڈائجسٹ 275 جنوری 2013ء



ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اگرچہ وہاں آنے والے اسے دیکھ کر لپٹاتے تھے اور جینا کی خوشامدیں کرتے تھے لیکن جینا کا اصول تھا کہ وہ کسی لڑکی کو زبردستی کام پر مجبور نہیں کرتی تھی۔ ہاں کوئی لڑکی اس کے لیے کام کرنے کو تیار ہو جاتی تو جینا اس سے پانچ سال کا معاہدہ کرتی تھی اور اس سے پہلے لڑکی کو آزادی نہیں ملتی تھی۔ سوہانہ سے بھی جینا نے پانچ سال کا معاہدہ کیا اور اسے چار سال گزر چکے تھے۔ ان چار سالوں میں سوہانہ نے جینا کو اس سے سو گنا زیادہ کم کر دیا تھا جتنا اس نے اس پر خرچ کیا تھا۔ وہ جینا ہاؤس کی سب سے مہنگی لڑکی تھی۔

کوئی سوا سال پہلے اس کی ملاقات شہزاد سے جینا ہاؤس میں ہوئی۔ پہلی ملاقات میں شہزاد نے اسے بتایا کہ وہ صرف اس کی خاطر یہاں آیا ہے۔ اس نے سوہانہ کو کہیں باہر دیکھا تھا اور اسے پسند کر بیٹھا تھا۔ اس وقت اسے نہیں معلوم تھا کہ سوہانہ ایک کال گرل ہے پھر وہ تلاش کرتے ہوئے جینا ہاؤس تک آ گیا اور تب اسے سوہانہ کی اصلیت کا پتا چلا لیکن اس کی محبت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس نے کوشش کر کے اس تک رسائی حاصل کر لی۔ سوہانہ نے اس کی بات کو استہزاء سے انداز میں لیا کیونکہ اس کے پاس آنے والے ہر دوسرے مرد کو اس سے محبت ہو جاتی تھی۔ اس نے شہزاد کا مذاق بھی اڑایا مگر وہ سنجیدہ رہا۔ اس نے ایک بار بھی سوہانہ کو ہاتھ نہیں لگایا اور جاتے ہوئے اس سے کہا۔ ”جلد تمہیں میری محبت کا اندازہ ہو جائے گا۔“

اس کے بعد شہزاد نے آنے والے ایک ہفتے کے لیے اسے بک کر لیا مگر ان تینوں موقعوں پر اس نے سوہانہ کو ہاتھ نہیں لگایا تو وہ اس کے دعوے کو سچ سمجھنے پر مجبور ہو گئی۔ ورنہ دوسرے محبت جتانے والے اپنا کام نکلنے تک دعوے کرتے تھے۔ سوہانہ عورت تھی اور اب تک کسی مرد نے اسے اس طرح سے احترام نہیں دیا تھا۔ وہ شہزاد سے محبت کرنے لگی۔ شہزاد تقریباً ہر ہفتے اس سے ملتا تھا لیکن اس نے بھی اس کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سوہانہ سے کہتا کہ وہ اسے یہاں سے نکال کر لے جائے گا اور باقاعدہ شادی کر کے اسے اپنائے گا مگر سوہانہ اسے یہی جواب دیتی کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ پانچ سال سے پہلے اسے جینا سے رہائی نہیں ملے گی۔ جلد اسے شہزاد کے بارے میں پتا چل گیا کہ اس کی اپنی کمائی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور اس کا بھائی باہر سے کم کر بھیجتا ہے۔ سوہانہ نے اس سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کی محنت کی کمائی اس پر یوں نہ لٹائے۔

مگر شہزاد کو اس سے ملے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ وہ خود

بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اس لیے سوہانہ نے یہ کیا کہ اپنی جمع پونجی جو بیس لاکھ کے قریب بنتی تھی، شہزاد کے حوالے کر دی۔ ساتھ ہی وہ اسے سونے کی مارکیٹ کے حوالے سے معلومات دینے لگی کیونکہ اس کے پاس آنے والوں میں ایک گولڈ ڈیلر بھی تھا اور وہ جانتا تھا کہ سونے کی قیمت میں اتار چڑھاؤ آئے گا۔ سوہانہ ہوشیاری سے اس سے سب معلوم کر کے شہزاد کو بتاتی۔ شہزاد اسی کی ٹپ کی مدد سے سونے میں سرمایہ کاری کر رہا تھا۔ اس طرح وہ خود کمائے لگا۔ ان دونوں نے ملے کیا کہ جب ان کے پاس ایک کروڑ روپے ہو جائیں گے تو سوہانہ شہزاد کے ساتھ جینا ہاؤس سے فرار ہو جائے گی اور وہ لاہور چلے جائیں گے۔ شہزاد اس سے نکاح کر کے اسے وہیں رکھے گا۔ اس دوران میں شہزاد بھائی کی مدد سے برطانیہ کا ویزا حاصل کر لے گا۔ اس کا ارادہ بعد میں سوہانہ کو وہاں بلا لینے کا تھا۔ اس طرح سوہانہ جینا کی پہنچ سے دور نکل جاتی۔

سوہانہ کو اس کے کام کا معاوضہ فوراً مل جاتا تھا۔ جینا کا اصول تھا کہ گاہک سے جتنا وصول کرتی تھی، اس میں سے چالیس فیصد لڑکی کو ملتا تھا۔ اگر گاہک لڑکی کو رقم یا تحفہ دیتا تھا تو یہ اس کی ملکیت ہوتا تھا۔ سوہانہ کو بھی بہت کچھ ملا تھا۔ اس کے پاس کلو بھر سونا تھا۔ اس نے وہ بھی شہزاد کے حوالے کر دیا۔ ایک سال میں اس نے دس لاکھ روپے مزید جمع کر لیے۔ وہ یہ رقم ساتھ لے کر نکلی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ زیورات اور دوسری قیمتی چیزیں بھی تھیں۔ ایک مہینے پہلے انہوں نے ملے کیا کہ اب سوہانہ یہاں نہیں رہے گی۔ مگر انہوں نے چالاکی سے کام لیا اور شہزاد نے سوہانہ سے ملنا بند کر دیا۔ اس نے یوں ظاہر کیا کہ اب وہ اس کے لیے کشش کھو چکی ہے۔ آخری بار وہ سوہانہ سے ایک ہفتے پہلے ملا تھا اور اس نے اسے تیار رہنے کو کہا تھا۔ ستائیس اور اٹھائیس دسمبر کی رات سوہانہ وہاں سے نکل آئی اور شہزاد اسے لے کر براہ راست لاہور روانہ ہو جاتا جہاں وہ اس کے لیے ایک دو مین ہاسٹل میں جگہ حاصل کر چکا تھا۔ سوہانہ کو کچھ دن یا ایک مہینہ یہاں رہنا تھا۔ اس کے بعد شہزاد راستہ صاف دیکھ کر آتا اور اس سے نکاح کر کے اسے کہیں گھر لے دیتا۔ ابھی وہ یہیں رہنا چاہتا تھا تا کہ اگر جینا اس پر شک کرے تو اسے کوئی خلاف معمول چیز نظر نہ آئے۔ شہزاد کو امید تھی کہ ایک مہینے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

”مگر اس سے پہلے ہی...“ سوہانہ بات پوری نہ کر سکی۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”تب تم کیوں نکلیں؟“

سوہانہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”جب شہزاد ایک ہفتے پہلے آخری بار آیا تو اس نے مجھے لا کر کی چابی اور اپنا اجازت نامہ دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہ کیوں کر رہا ہے؟ اس نے کہا آدمی کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تمہاری ساری کمائی اور دولت میرے پاس رہ جائے گی۔ اس نے بتایا کہ اس نے سب لا کر میں رکھ دیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے سوہانہ کو پچیس لاکھ کا چیک بھی دیا تھا۔ یہ وہ رقم تھی جو سوہانہ نے اسے دی تھی اور اس نے سونے میں سرمایہ کاری کر کے مزید پانچ لاکھ کمائے تھے۔ سوہانہ اس کی باتوں سے خوف زدہ ہوئی اور اس نے شہزاد سے پوچھا کہ وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے؟ تب اس نے ہنس کر کہا کہ وہ حفاظتی تدبیر کر رہا ہے۔ ”لیکن مجھے لگا کہ کوئی بات تھی۔ وہ کچھ فکر مند اور عجیب سا لگ رہا تھا میرے اصرار کے باوجود اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس نے مجھے سب بتا دیا تھا کہ جینا... ہاؤس سے نکل کر مجھے کیا کرنا ہے۔“

”جب تم نے مجھے دیکھا تو تم نے کچھ ایسی باتیں کیں جیسے تمہیں کسی پر شک ہو کہ شہزاد کا قاتل وہی ہے۔“

”مجھے جینا ہاؤس والوں پر شک تھا۔“ سوہانہ نے کہا۔

”جینا نے ایسے بد معاش پال رکھے ہیں جو اس کے اشارے پر کسی کو بھی قتل کر سکتے ہیں اور وہ کئی بار ایسا کر چکے ہیں۔“

”یہ اتنی خطرناک عورت ہے؟“ حیات نے حیرت سے کہا۔

”اس سے بھی کہیں زیادہ... شہزاد کی خبر سنتے ہی میرا دھیان اس کی طرف گیا تھا اور مجھے شک ہوا کہ اسے ہمارے منصوبے کا علم ہو گیا تھا لیکن جب اس نے مجھ سے کوئی باز پرس نہیں کی تو مجھے اطمینان ہوا اور میں نے فرار کے منصوبے پر عمل کیا۔“

”اب شہزاد نہیں رہا تب تم...؟“

”ہاں، وہ نہیں رہا لیکن وہ مجھے اس گندے سے تو نکالنا چاہتا تھا اور میں خود کون سا اس میں رہنا چاہتی تھی اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے چلی جاؤں گی۔ میرے پاس اتنی دولت تھی کہ میں کہیں چھپ کر سادہ زندگی گزاروں تو ساری عمر کے لیے کافی ہوتی۔ ایک کروڑ روپے انویسٹ کرتی تو مجھے آرام سے لاکھ روپے مہینے کے ملتے رہتے اور اتنی رقم ایک اکیلے فرد کے لیے کافی ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن پولیس کے علم میں آنے کے بعد اب لا کر تک رسائی آسان نہیں ہے۔“ حیات نے بتایا۔

زور گدیدہ

”کل میں ڈی ایس بی کے ساتھ جا کر کورٹ سے آرڈر لوں گا۔ اس کے بعد ہی لا کر کھولنے کی اجازت ملے گی لیکن اس میں سے کچھ نکالنا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح اکاؤنٹ سے رقم نہیں نکلیے گی۔“

سوہانہ پریشان ہو گئی۔ ”تب کیا ہوگا؟ میرے پاس تو بس یہ دس لاکھ ہیں۔“

”تم فکر مت کرو اور کچھ عرصے یہاں رہو، اس دوران میں یہ معاملہ سیٹ ہو جائے گا۔“

”یہاں مجھے خطرہ ہے۔“ وہ بولی۔ ”میں لاہور جاؤں گی۔“

”اگر تم لاہور جانا چاہتی ہو، تب بھی کچھ دن تو رک جاؤ... میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم شہزاد کے قاتلوں کی گرفتاری میں مدد دو۔“

”میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

”ابھی کیا کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ممکن ہے تمہیں کوئی بات یاد آجائے جس سے یہ معاملہ ہو جائے۔“ حیات نے التجا کی۔ ”تم اس سے محبت کرتی تھیں، اس لیے اس کا تم پر حق بنتا ہے۔“

”اگر میری مدد سے شہزاد کا قاتل گرفتار ہو سکتا ہے تو اس کے لیے میں اپنی جان بھی دینے کو تیار ہوں۔“

”میں تم سے شہزاد کی نجی زندگی کے بارے میں کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی۔“

”کیا وہ کبھی تمہارے... میرا مطلب ہے تم سے اس کا کوئی ایسا تعلق جو...“

”نہیں۔“ سوہانہ نے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ جواب دیا۔ ”اس نے بھی مجھے اس نیت سے ہاتھ نہیں لگایا۔“

”تم جانتی ہو، وہ شراب پیتا تھا؟“

”ہاں لیکن جب ہم نے فرار کا پلان بنایا تو اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔“

حیات کو ان باتوں کا خیال آیا جو سر بمبر تھیں۔ یعنی شہزاد نے اپنے وعدے پر عمل بھی کیا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس نے یہ تو نہیں بھی رکھی تھیں۔ ”اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ مارفین کا نشہ کرتا تھا، انجکشن کی مدد سے؟“

”شروع میں کرتا تھا لیکن چھ مہینے پہلے اس نے چھوڑ دیا تھا۔“

”تم نے پوچھا نہیں کہ اسے ان لتوں کا شکار کس نے بنایا تھا؟“



## شریف لڑکی

فرانس کے سابق صدر پنکارا PINCKRA

اپنی جوانی کے دور میں پیرس کے ممتاز وکیل تھے۔ وہ جنگ عظیم کے ابتدائی چھ سال میں فرانس کے صدر تھے۔ ان کو ایک لڑکی سے محبت تھی اور وہ اس سے شادی کے خواہاں تھے۔ انہوں نے سوچا کیوں نہ شادی سے پہلے اس کے متعلق تحقیقات کرائی جائے۔ چنانچہ انہوں نے پیرس کے ایک مشہور سراغ رساں کو خط لکھا کہ میں اپنی ہونے والی بیوی کے متعلق چھان بین کرنا چاہتا ہوں، ساتھ ہی انہوں نے ایک ہزار روپے کا چیک بھی بھیج دیا۔ پندرہ دن بعد سراغ رساں کا جواب آیا۔ لکھا تھا: ”لڑکی واقعی بڑی شریف ہے۔ محنت کشوں کے ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہے لیکن کچھ عرصے سے ایک وکیل کے ساتھ دیکھی جا رہی ہے جس کی لوگ بڑی برائی کرتے ہیں۔ اس کا نام پنکارا ہے۔ اگر وہ لڑکی اس وسیلے سے قطع تعلق کر لے تو بہت اچھی اور شریف لڑکی ثابت ہو سکتی ہے۔“

(طارق علی صدیقی، نارتھ ناظم آباد، کراچی)

کہا۔ ”وہ بہت دیکھی ہیں۔“

حیات نے گہری سانس لی۔ ”ظاہر ہے، وہ ماں ہیں۔“

شکیلہ تم سے کیا بات کر رہی تھی؟“

”وہ پوچھ رہی تھی کہ میں کون ہوں اور آپ تک کیسے پہنچی۔“

”تم نے کیا بتایا؟“

”وہی جو آپ نے کہا تھا۔“ وہ بولی۔ ”لیکن شکیلہ

بہت زیادہ سوالات کر رہی تھی۔ بعض اوقات مجھے جواب دینا

مشکل ہو رہا تھا۔ شکر ہے آپ آگے ورنہ میں پریشان ہو گئی

تھی۔“

”تم فکرمند کرو، میں اسے سمجھا دوں گا۔“

”اس نے ایک عجیب سی بات کی تھی۔ اس نے

اچانک ہی باتوں کے دوران میں کہا کہ اگر شہزاد بھائی زندہ

ہوتے تو آپ کو یہاں دیکھ کر خوش ہوتے۔ کیا اسے میرے

اور شہزاد کے تعلق کا علم ہے؟“

”ممکن ہے، وہ دونوں بہن بھائی تھے اور ہر وقت کا

ساتھ تھا۔ مجھے بھی شبہ ہے کہ شکیلہ شہزاد کی سرگرمیوں کے

بارے میں جانتی ہے لیکن اس نے مجھے کچھ بتایا نہیں۔“

چھوٹا بریف کیس رکھا تھا۔ ممتاز نے اسے اٹھایا تو خاصا وزن کی لگا۔ یہ لاک نہیں تھا۔ اسے کھولا تو اس کے اندر سونے کی چھوٹی اینٹیں رکھی تھیں۔ یہ سوگرام والی اینٹیں تھیں اور ان کی تعداد پندرہ تھی۔ یعنی بریف کیس میں ڈیڑھ کلوگرام خالص سونا تھا۔ دوسری چیز ایک بڑا پلاسٹک کالفا تھا جس میں پانچ ہزار کے نوٹوں والی بینک کی سیل بند چار گڈیاں تھیں۔ یہ بیس لاکھ روپے تھے۔ گویا لاکھوں تقریباً کروڑ روپے مالیت کا سونا اور نقدی تھی۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے لاکر بند کیا اور باہر آئے۔

”میرا خیال ہے، آپ کا کہنا درست ہے۔ شہزاد کوئی کام اور بھی کر رہا تھا، تب ہی اس کے پاس اتنی بڑی مالیت کی رقم اور سونا موجود تھا۔“

”مزید کوئی پیش رفت ہوئی ہے؟“

”فی الحال تو نہیں۔“ ممتاز نے کہا۔ ”یہ اندھا کیس ہے جس میں سارے راستے ایک بند گلی میں کھل رہے ہیں۔“ ”مجھے بھی شہزاد کا کیس اس طرح سے حل ہونا نظر نہیں آ رہا تھا۔“ حیات نے مایوسی سے کہا۔ ”شہزاد کی چیزوں کا کیا بنے گا؟“

”گاڑی تو کورٹ آرڈر سے ملے گی لیکن سوٹ کیس

اور باقی چیزیں آپ ابھی لے جاسکتے ہیں۔“

حیات اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن تک آیا جہاں ممتاز

نے اسے سوٹ کیس اور شہزاد کے پاس سے ملنے والی چیزیں

دیں۔ وہ گھر روانہ ہوا۔ اسے سوہانہ سے اپنی رات کی گفتگو

یاد آ رہی تھی اور اس میں کوئی بات رہ رہ کر کھٹک رہی تھی۔ مگر

انجی وہ گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ گھر پہنچا اور سیامان اپنے

کمرے میں لے آیا۔ جیل کی طبیعت سنبھل گئی تھی لیکن وہ

زیادہ تر کمرے تک محدود رہتی تھی۔ شکیلہ بھی اپنے کمرے

میں رہتی تھی البتہ جب ملازما کی آتیں تو وہ ان کی نگرانی

کرتی۔ سوہانہ شہزاد والے کمرے میں تھی۔ وہ جو بیگ لے کر

آئی تھی، اس میں اس کے دو جوڑے بھی تھے اس لیے گزارہ

ہو رہا تھا۔ وہ سوہانہ کے کمرے تک آیا اور اس نے دستک دی

تو اندر سے شکیلہ نکلی۔ وہ سوہانہ سے بات کر رہی تھی۔ حیات کو

دیکھ کر وہ جلدی سے چلی گئی۔ حیات نے باہر سے کہا۔ ”مجھے تم

سے بات کرنی ہے۔“

”تو آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آجائیے۔“

سوہانہ بولی۔ اس نے آج بڑا سادو پہنا لیا ہوا تھا۔ حیات اندر

آ گیا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے آنٹی سے ملی ہوں۔“ سوہانہ نے

اپنی جیب میں کس کے ساتھ کہاں جا رہا تھا؟ جب قاتلوں نے اسے روکا اور پھر اس کا پیچھا کر کے اسے قتل کر دیا۔ قاتل کون تھے؟

سوہانہ سے ملنے کے بعد جینا ہاؤس والوں پر شبہ بہت کم ہو گیا تھا۔ اگر انہوں نے شہزاد کو مارا ہوتا تو وہ سوہانہ پر بھی سختی کرتے اور وہ اتنی آسانی سے جینا ہاؤس سے فرار نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا فرار ہی اس بات کا ثبوت تھا کہ جینا ہاؤس والوں کا شہزاد کے قتل سے تعلق نہیں تھا۔ حیات کی آنکھ دیر سے لگی اور دو گھنٹے بعد ہی الارم سن کر کھل گئی۔ اسے یاد آیا کہ اسے ڈی ایس پی ممتاز کے ساتھ کورٹ جانا تھا۔ اس نے جلدی سے اس سے کال کر کے ملاقات کا پوچھا۔ ”میں کہاں آؤں؟“

”ایسا کریں، کورٹ ہی آجائیں۔“ ممتاز نے مشورہ

دیا۔ ”وہ آپ کو پاس پڑے گا۔ آپ باہر میرا انتظار کیجیے گا۔“

حیات نو بجے کورٹ پہنچ گیا۔ پندرہ منٹ بعد ممتاز بھی

آ گیا۔ وہ دونوں کورٹ میں پیش ہوئے اور ممتاز نے عدالت

سے بینک لاکر کھولنے کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ اگرچہ

حیات کو معلوم تھا کہ لاکر میں کیا ہوگا لیکن اس نے ممتاز پر ظاہر

نہیں کیا اور نہ اس نے اسے سوہانہ کے بارے میں بتایا۔ اس

کے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ سوہانہ یا جینا

ہاؤس کا اس قتل سے تعلق ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ وہاں سے وہ

سیدھے بینک پہنچے اور اجازت نامہ منجر کو پیش کیا۔ اس نے

کہا۔ ”ٹھیک ہے، بینک آپ سے تعاون کرے گا مگر شہزاد

احمد کے پاس لاکر کی چابی تھی۔ اس کی ضرورت پڑے گی۔“

حیات سوہانہ سے چابی لے آیا۔ اس نے چابی

دکھائی۔ ”میرے پاس ہے۔“

ممتاز نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”آپ کو کہاں سے

ملی؟“

”میں نے پہلے ہی دیکھ لی تھی لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ

بینک لاکر کی چابی ہے۔“ حیات نے مطمئن کرنے والا جواب

دیا۔

”لیکن آپ لاکر سے کچھ نکالیں یا اس میں کچھ رکھیں

گے نہیں۔“ منجر نے انہیں خبردار کیا۔

”میں قانون سمجھتا ہوں۔“ ممتاز نے سرد لہجے میں

کہا۔ ”آپ پلیز اپنا کام کریں۔“

منجر انہیں لاکر روم میں لایا۔ اس نے لاکر میں اپنی

والی چابی لگائی، تالا کھولا اور باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے

بعد ممتاز نے شہزاد والی چابی لگا کر لاکر کھولا۔ سامنے ایک

”کتنی بار پوچھا لیکن وہ ٹال جاتا تھا۔ ایک بار اس نے بتایا کہ ایک دوست نے اسے شراب اور مارفین کے نشوں پر لگایا تھا۔“

”دوست کا نام؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ سوہانہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے، تم آرام کرو۔ میں نے شہزاد کا کمر اکھول

دیا ہے۔ تم وہیں رہو گی۔“

”میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ اب مجھے پتا چلا کہ شہزاد

میں اتنی خرابیوں کے باوجود ایک مخصوص اچھائی کیوں تھی۔ وہ

کبھی برائی میں حد سے آگے کیوں نہیں گیا۔“

”ہاں، ہمارے باپ نے ہمیں حلال کھلایا تھا اور

میں نے بھی جو کمایا، اس کا ایک ایک روپیہ حلال کا ہے۔ شاید

اسی وجہ سے شہزاد ایک حد سے آگے نہیں گیا اور اسے سمجھ بھی

آگئی لیکن۔۔۔“ حیات نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سوہانہ کی

آنکھوں میں نمی آگئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”اگر آپ کو میرے ماضی کا پتا چل جاتا تو کیا آپ

لوگ مجھے قبول کر لیتے؟“

”ہمارا مسئلہ ثانوی ہوتا۔ اصل میں تو شہزاد کو تمہیں

قبول کرنا تھا اور اس نے تمہیں قبول کر لیا تھا۔“

”پھر بھی۔۔۔“

”جو گزر گیا، اس پر سوچنا یا بات کرنا بیکار ہے۔“

حیات نے نرمی سے کہا۔ ”تم اس معاملے میں سرمت کھاؤ اور

جا کر آرام کرو۔ امید ہے تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

اور ہاں، شکیلہ یا امی کو یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم

صرف اتنا کہہ سکتی ہو کہ تم ایک مظلوم ہو، دنیا میں اکیلی ہو اور

کچھ لوگوں سے خطرہ ہے۔ اتفاق سے میں تمہیں مل گیا اور میں

نے تمہیں عارضی پناہ دی ہے۔“

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ سوہانہ نے جواب دیا۔

حیات کمرے میں آیا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے

لیکن اس کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ سوہانہ سے ملنے کے

بعد بہت ساری باتوں سے پردہ اٹھ گیا تھا اور اب شہزاد کی

بہتر تصویر سامنے آئی تھی۔ وہ برائی کے راستے سے ہٹ گیا تھا

اور اس نے ایک کال گرل کو اس گندگی سے نکالنے کا سوچا

تھا۔ اسے قدرت نے مہلت نہیں دی ورنہ وہ یقیناً سوہانہ سے

شادی کر لیتا۔ حیات کے خیال میں اس میں کوئی برائی نہیں

تھی۔ سوہانہ اپنی خوشی سے اس دلدل میں نہیں اتری تھی۔ وہ

مجبور تھی اور انسان کی مجبوری قابل معافی ہوتی ہے۔ مگر یہ معما

مزید الجھ گیا تھا کہ اس رات شہزاد کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ وہ



”آپ کہیں تو میں اس سے پوچھوں؟“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ حیات نے سوچ کر کہا۔ ”میں نے ڈی ایس پی کے ساتھ جا کر شہزاد کا لاکر دیکھا۔ اس میں تقریباً ایک کروڑ روپے مالیت کا سونا اور نقدی موجود ہے۔ یہ شہزاد نے تمہارے لیے رکھا تھا؟“

سوہانہ نے سر ہلایا۔ ”لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ مجھے یہ سب حاصل کرنے میں کچھ وقت لگے گا؟“

”بالکل... کچھ وقت ضرور لگے گا کیونکہ جب تک اکاؤنٹس اور لاکر قانونی طور پر ہمیں منتقل نہ ہو جائے، کوئی اس میں سے کچھ نکالنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ اگر میرے ساتھ ڈی ایس پی نہ ہوتا تو میں سونا اور نقدی تمہارے لیے نکال لاتا۔“

”کوئی بات نہیں، میں انتظار کروں گی۔ یہ بتائیں کہ پولیس نے کچھ معلوم کیا؟“

”نہیں، مجھے لگ رہا ہے کہ شہزاد کے ساتھ جو ہوا، اچانک ہوا اور اس طرح ہونے والے لال کا سراغ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے؟“

”یقین سے کچھ کہنا تو دشوار ہے مگر لگایا رہا ہے کہ اس دوران جگہ اس کا سامنا کچھ دشمنوں سے ہو گیا۔ وہ ان سے بھڑایا وہ اس سے کے پیچھے لگ گئے۔ بہر حال اس کشمکش میں شہزاد کے سر پر وار لگا اور وہ مارا گیا۔ اب وہ لوگ کون ہیں اور شہزاد سے کیا دشمنی تھی، اس کا پتا چلانا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کا کسی سے تعلق نہیں تھا۔“

سوہانہ نے اچانک کہا۔ ”کہیں اس کے دوستوں میں سے کسی کا کام نہ ہو۔ آخر اسے شراب اور مارفین پر بھی ان میں سے کسی نے لگایا تھا۔“

”اس کے تین دوست ہیں۔ تینوں اس معاملے سے لا تعلق پائے گئے۔ ان میں سے ایک تو کراچی میں اپنی بہن کے پاس تھا۔“

”میرا خیال ہے، ان تینوں کا تعلق دولت مند گھروں سے ہوگا۔ اس لیے ممکن ہے کہ پولیس نے ان کے بیانات کی پوری طرح چھان بین نہ کی ہو، ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ دوست، دوست کی مشکلوں اور دشمنی سے بے خبر ہو۔“

سوہانہ کی بات نے حیات کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ ان تینوں کا کہنا تھا کہ شہزاد ایک ہفتے سے ان سے نہیں ملا تھا اور سوہانہ سے بھی وہ ایک ہفتے پہلے آخری بار ملا تھا۔ آخر اس دوران میں وہ کیا کرتا رہا تھا؟ حیات نے سوہانہ سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں ڈی ایس پی سے اس سلسلے میں

بات کروں گا۔“

حیات، جیلہ کے پاس آیا۔ وہ جب سے آیا تھا، شہزاد کے قتل کے معے میں الجھا ہوا تھا۔ ماں کے پاس بیٹھنے کا موقع کم ملا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پھر رونے لگی۔ حیات... اسے چپ کرانے لگا۔ کچھ دیر میں وہ سنبھل گئی۔ ”کاش تو باہر نہ جاتا تو شاید شہزاد زندہ ہوتا۔“

”یہ تو مقدر میں تھا۔“

”نہیں، دولت نے میرا گھر برباد کر دیا۔“ جیلہ بولی۔

”امی! وہ بگڑا ضرور تھا لیکن پھر راستے پر آ گیا تھا۔ اس نے بری عادتیں چھوڑ دی تھیں۔“

جیلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تم کیسے جانتے ہو؟“

”بس امی میں جان گیا ہوں۔ لیکن امی، وہ اپنے آخری ہفتے میں پریشان تھا۔ کیا آپ نے یہ بات محسوس نہیں کی تھی؟“

اس بار جیلہ واضح چوکی۔ ”حیات! تجھے کیسے پتا چلی یہ بات؟“

”امی! میں نے بہت سارا وقت یہ جاننے میں لگایا ہے۔ اسی لیے آپ کے پاس بھی کم رہا ہوں۔ آپ نے شہزاد سے پوچھا تھا؟“

جیلہ نے سر ہلایا۔ ”پوچھا تھا اور اس نے یہی کہا تھا کہ دولت نے ہمارے گھر کو برباد کر دیا۔ میں نے پھر پوچھا لیکن اس نے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔“

حیات سوچ میں پڑ گیا۔ شہزاد نے ایسا کیوں کہا؟ جبکہ وہ خود سدھر گیا تھا۔ اس نے نشہ چھوڑ دیا تھا اور اگر پہلے عورتوں کے چکر میں تھا تو اب وہ بھی نہیں تھا۔ وہ سوہانہ سے محبت کرنے لگا تھا اور ظاہر ہے اسی سے شادی کرتا۔ ”امی! آپ کو شہزاد کی آخری ایک ہفتے کی مصروفیات یاد ہیں؟ وہ گھر میں کیا کرتا تھا اور باہر کب جاتا تھا؟“

”وہ عام طور سے شام کے وقت باہر جاتا تھا لیکن تھوڑی دیر کے لیے۔ آخری ہفتے میں وہ زیادہ تر گھر میں رہا تھا۔“

”کمرے میں رہتا تھا؟“

”نہیں، لاؤنج میں بیٹھا رہتا تھا جہاں ٹیلی فون ہے یا پھر ڈرائنگ روم میں ہوتا تھا۔ کمرے میں رات کو جاتا تھا۔“

”آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ کس وجہ سے پریشان تھا؟“

”میں نے بہت کوشش کی لیکن وہ مجھے نال دیتا تھا

لیکن مجھے لگ رہا ہے اس کی پریشانی کا تعلق گھر سے تھا۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا کہ کاش حیات بھائی باہر نہ جاتے تو ہم اس حال کو نہ پہنچتے۔“

”آخر ایسی کیا وجہ تھی؟“ حیات نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، یہ بتائیے کہ اس دوران میں اس سے کوئی ملنے آیا یا اس کے فون آتے تھے؟“

”نہیں، اس دوران میں کوئی ملنے نہیں آیا۔ موسم بہت خراب تھا اور اس وقت برف باری ہو رہی تھی۔ شاید فون آتے تھے لیکن بہت زیادہ نہیں۔“

”پولیس نے شہزاد کا سامان دے دیا ہے لیکن اس میں اس کا موبائل نہیں ہے۔“ حیات نے کہا۔ ”صرف اس کا پرس، گھڑی، رومال، چابیوں کا گچھا اور اسی طرح کی چند عام چیزیں ہیں۔“

جیلہ بے قرار ہو گئی کہ وہ یہ چیزیں دیکھے گی۔ حیات اپنے کمرے سے شاپر میں رکھی یہ سب چیزیں لے آیا۔ البتہ اس نے جیلہ کو سوٹ کیس کے بارے میں نہیں بتایا۔ اگر وہ سوٹ کیس کا بتاتا تو شاید اسے باقی بات بھی بتانی پڑتی۔ جیلہ شہزاد کا پرس اور دوسری چیزیں چہرے سے لگا کر رونے لگی۔ حیات نے انہیں رونے دیا۔ رونے سے دکھ کم تو نہیں ہوتا، اس زخم کو وقت ہی بھر سکتا تھا لیکن اندر کی گھٹن کم ہو جاتی۔ جیلہ سنبھلی تو اس نے سوہانہ کے بارے میں پوچھا۔ ”حیات! یہ بچی کون ہے اور تجھے کہاں سے ملی؟“

حیات نے ماں کو بھی وہی سب بتایا جو سوہانہ سے ملے کیا ہوا تھا۔ جیلہ دکھی ہو گئی۔ ”اتنی پیاری بچی کا ایسا نصیب... شکر ہے کسی بُرے آدمی کے ہاتھ نہیں لگی ورنہ برباد ہو جاتی۔“

اگر جیلہ کو معلوم ہو جاتا کہ سوہانہ کا تعلق کہاں سے ہے اور وہ کیسی زندگی گزارتی آئی ہے پھر شہزاد سے اس کا تعلق سامنے آ جاتا تو شاید جیلہ کا رد عمل بالکل برعکس ہوتا مگر ابھی اسے سوہانہ سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ حیات نے کہا۔ ”اس کے کچھ جاننے والے لاہور میں ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کچھ دن میں جا کر اسے وہاں چھوڑ آؤں گا۔“

”پتا نہیں وہ بھی رکھتے ہیں یا نہیں... کچھ اسے چین سے یہاں رہ لینے دے۔ اب میں خود اس کا خیال رکھوں گی۔“

دوپہر کا کھانا سوہانہ نے سب کے ساتھ کھایا۔ کھانے کے بعد حیات چہل قدمی کرنے باہر نکل آیا۔ ہوا رک گئی تھی لیکن سردی میں کوئی کی نہیں آئی تھی۔ بہر حال اسے کھلی فضا

زرگذیدہ

میں ٹہلنا اچھا لگتا تھا۔ وہ نیچے باغ میں آیا جہاں رضوان زمین سے خشک پتے سمیٹ کر ایک گڑھے میں ڈال رہا تھا۔ اسے دیکھ کر رضوان نے ادب سے سلام کیا۔ جواب دے کر حیات نے اس سے خیر خیریت پوچھی۔ ”تم ذرا کام سے فارغ ہو جاؤ۔ تم سے بات کرنی ہے۔“

”جی صاحب! اس منٹ کا کام رہ گیا ہے۔“

حیات باغ کا معائنہ کرتا رہا۔ اب باغ مکمل پلاننگ سے لگایا گیا تھا، اس لیے یہاں پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ درخت تھے۔ یہ سب اعلیٰ نسل کے درخت تھے اور ان کا پھل اچھی قیمت میں جاتا ہوگا۔ شہزاد نے واقعی محنت کی تھی۔ رضوان فارغ ہو کر آیا۔ ”جی جناب۔“

”رضوان! تم یہاں تقریباً سال بھر سے ہو اور دن میں تم چوکیدار ہوتے ہو یعنی گھر میں کوئی آئے یا جائے تمہیں لازمی پتا ہوتا ہے؟“

”جی جناب... لیکن صبح آٹھ سے رات سات بجے تک... پھر میں سونے چلا جاتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے... شہزاد کے قتل سے ایک ہفتہ پہلے تک گھر میں کون کون آیا تھا؟“

”کوئی بھی نہیں جناب... موسم بہت خراب تھا اور ایسے موسم میں کوئی باہر نہیں نکلتا۔“

”شہزاد باہر گیا تھا؟“

”جی، میرے سامنے ایک یا دو بار گئے تھے۔ اگر رات کو کسی وقت گئے ہوں تو مجھے پتا نہیں۔“

حیات خاصی دیر اس سے پوچھ گچھ کرتا رہا لیکن کوئی کام کی بات سامنے نہیں آئی۔ حیات کو محسوس ہوا کہ اس معاملے میں کوئی پراسراریت نہیں تھی۔ شہزاد کے ساتھ جو ہوا، اس کا پہلے سے کوئی پس منظر تھا بھی تو اس کا اس کی عام زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ اس کی عام زندگی میں تو سب ہی نارمل نظر آ رہا تھا۔

شام کے وقت موسم کے تیور پھر خراب ہونے لگے۔ باہر تیز ہوا میں چلنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی برف کے ٹکڑے اڑنے لگے۔ وہ سب رات کے کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ سوہانہ شاید اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر حیات ابھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ جھنجھلا رہا تھا اور اس کی وجہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ رات ہوتے ہوتے ہوا بہت تیز ہو گئی۔ جب وہ زور لگاتی تو کھڑکیوں سے آواز آتی۔ نشست گاہ اور اس سے ملحق لاؤنج کی روشنیاں بند تھیں۔ اچانک ایک سایہ نشست گاہ میں



## اقوال زریں

☆ عورت کی عزت شریف طبیعت والے لوگ کرتے ہیں۔ (حضور اکرم)

☆ جو پاک دامن عورت پر تہمت لگائے اس کو سلام نہ کرو۔ (حضرت علی)

☆ ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت نیک عورت ہے۔ (حضرت عمر)

☆ خوب صورت عورت ایک لعل ہے اور نیک عورت خزانہ۔ (ہملین)

☆ عورت کی گود انسان کا پہلا مکتب ہے۔ (سینڈی)

☆ عورت سے بات کرتے وقت وہ سنو جو عورت کی آنکھیں کہتی ہیں۔ (وکر ہیکو)

(مرسلہ: عطیہ ناہید، ملتان چھاؤنی)

حیات چونکا۔ ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

سوہانہ کچھ کہنے جا رہی تھی کہ اس کی نظر سوٹ کیس پر پڑی۔ یہ شہزاد کی گاڑی سے نکلنے والا سوٹ کیس تھا۔ ”کیا یہ وہی سوٹ کیس ہے؟“

”ہاں۔“ حیات نے کہا۔

”کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟“ سوہانہ نے تجسس سے کہا۔

”ہاں، کیوں نہیں... دیکھ سکتی ہو؟“

سوہانہ نے سوٹ کیس کھولا اور اس میں موجود کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ حیات کی توجہ نہیں تھی بلکہ وہ سوچ رہا تھا کہ سوہانہ کو اس کے کمرے سے چلے جانا چاہیے ورنہ امی یا شکیلہ نے دیکھ لیا تو کیا سوچیں گی۔ سوہانہ ایک ایک سوٹ دیکھ رہی تھی پھر وہ بڑی طرح چونکی۔ ”یہ...“

حیات متوجہ ہوا۔ ”کیا ہوا؟“

سوہانہ ہاتھ میں ایک نیلے رنگ کا سوٹ لیے کھڑی تھی جس پر نیلے رنگ کا بارڈر لگا تھا اور کڑھائی ہوئی تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی۔ حیات نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ اس سوٹ میں کوئی خاص بات ہے؟“

”نہیں...“ وہ بولی۔ ”کیا میں اسے لے سکتی ہوں؟“

تھے۔ وہ اس سے تمہارا پوچھ رہے تھے۔“

سوہانہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”وہ یقیناً جینا ہاؤس کے آدمی ہوں گے۔ انہوں نے یہاں میرا سراغ لگالیا ہے۔“

”نہیں، رضوان نے تمہاری موجودگی سے انکار کیا ہے اور میں نے ہوائی فائر کیے تو وہ بھاگ گئے۔ مگر انہیں پتا کیسے چلا کہ تم یہاں ہو؟“

”آپ نہیں جانتے جینا کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس نے کسی نہ کسی طرح پتا چلا لیا ہوگا۔ اب میری وجہ سے آپ لوگ بھی خطرے میں پڑ گئے ہیں۔“

”تم فکر مت کرو، کچھ نہیں ہوگا۔“

”نہیں، مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

”اچھا، اس پر صبح بات کریں گے۔“ حیات نے کہا۔

”ابھی تم جا کر آرام کرو۔“

مگر سوہانہ اس کے پیچھے آئی۔ ”میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“

”اب اتنا خطرہ نہیں ہے... میں رپورٹ کر دیتا ہوں۔“

”پولیس والے کچھ نہیں کر سکتے بلکہ یہ خود جینا کے نمک خوار ہیں۔ میں نے جینا ہاؤس میں کتنے اعلیٰ پولیس افسران کو آتے دیکھا ہے۔“

”اس صورت میں تمہارا باہر جانا بھی خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ وہ راستے میں بیٹھے ہیں اور ممکن ہے گزرنے والوں کو چیک کر رہے ہوں۔ ابھی انہیں صرف شک ہے۔“

”شک نہیں میرے خیال میں انہیں اطلاع پہنچ گئی ہے۔“ سوہانہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”کس نے پہنچائی ہے؟“

”ضروری نہیں ہے کسی نے اطلاع پہنچائی ہو۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔“

حیات نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے اگر میں یہاں کچھ اور رک گئی تو بالآخر جینا ہاؤس میرا مقدر بنے گا۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ حیات نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”میرے جیسے جی ایسا نہیں ہوگا۔ تم شہزاد کی محبت ہو اور میں کسی صورت تمہیں دوبارہ اس زندگی میں جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔“

”اجازت۔“ وہ ہنسی۔ ”حیات صاحب! یہاں بہت کچھ آپ کی اجازت کے بغیر ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔“

تھا۔ ”گولی مار دوں گا۔“

جواب میں ایک فائر ہوا اور گولی حیات کے پاس سے گزر گئی۔ وہ احتیاط بھول گیا اور زمین پر گرے ہوئے اس سمت لگا تار کئی فائر کیے۔ کوئی چلا یا پھر بھاگنے کی آواز آئی۔ حیات نے پھر دو ہوائی فائر کیے اور چلا کر رضوان سے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

”جی جناب... وہ بھاگ گئے ہیں۔“ رضوان نے جواب دیا۔

پھر بھی حیات احتیاط سے آگے بڑھا اور ایک درخت کی اوٹ سے جھانکا۔ کوٹھری کے سامنے چلنے والے بلب کی روشنی میں رضوان زمین پر بندھا پڑا دکھائی دیا۔ حیات اس کے پاس سے گزر کر سڑک کی طرف بڑھا تھا کہ اسے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پھر گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ جب وہ سڑک تک پہنچا، گاڑی کی عقبی روشنیاں بھی غائب ہو چکی تھیں۔ وہ واپس آیا اور رضوان کو کھولا۔ سردی اور خوف سے اس کی حالت بُری ہو رہی تھی۔ حیات اسے کوٹھری میں لے آیا جہاں انگلیٹھی روشن تھی اور حرارت سے رضوان کی جان میں جان آئی۔ اس کے چہرے پر تشدد کے نشانات تھے۔ ”کیا ہوا تھا؟“

”وہ تین آدمی تھے جناب... مجھ سے ان بی بی کا پوچھ رہے تھے جو کوٹھی میں ہیں۔ میں نام نہیں جانتا لیکن وہ حلیہ بالکل وہی بتا رہے تھے مگر میں نے انکار کیا کہ یہاں ایسی کوئی عورت نہیں ہے۔“

”شباباش! تم نے حوصلے سے کام لیا۔ کچھ اندازہ ہے وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟“

”انہوں نے چہرے ٹوہیوں سے چھپا رکھے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ لہجے سے اور اپنی حرکتوں سے بد معاش لگ رہے تھے۔“ رضوان خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”صاحب! مجھے چھٹی دیں۔“

”تم ڈرو مت... اگر تمہیں زیادہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے تو جنگل کے اوپر اسٹور روم میں شفٹ ہو جاؤ۔“

رضوان کی چوٹیں معمولی تھیں اس لیے حیات اسے سونے کا کہہ کر جنگل میں آ گیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو سوہانہ اسے نشست گاہ میں شال اوڑھے دکھائی دی۔ وہ ٹھنک گیا۔

”تم جاگ رہی ہو؟“

”ہاں فائرنگ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ آپ کہاں گئے تھے اور باہر کیا ہو رہا تھا؟“

”کچھ لوگ ہمارے چوکیدار کو باندھ کر تشدد کر رہے

داخل ہوا۔ اس نے فون کا ریسور اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔ کال ملنے پر اس نے بہت آہستہ سے کہا۔ ”میں بات کر رہی ہوں۔“

”میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن یہ تم فون سے کال کرو...“

”موبائل سنگل نہیں ہیں۔“ وہ بات کاٹ کر بولی۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“

”ان حالات میں پلان پر عمل درآمد کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”لیکن اب میں اور انتظار نہیں کر سکتی۔“ اس کے لہجے میں سختی تھی۔

”تم سمجھنے کی کوشش کرو... شہزاد کے قتل کی وجہ سے پولیس بہت سرگرم ہے۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ”اگر جینا ہاؤس والوں کو پتا...“

”اس بارے میں کوئی لفظ منہ سے مت نکالنا ورنہ ہم پھنس جائیں گے۔ ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ خاموش رہیں۔“

اس نے ریسور رکھ دیا وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر ریسور اٹھا کر ایک نمبر ملانے لگی۔

☆☆☆

حیات اپنے کمرے میں سوچتے ہوئے ٹہل رہا تھا۔ اس بار وہ سوچ رہا تھا کہ اب ماں اور بہن کو یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ انہیں ساتھ لے جاتا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ باہر کوئی چلا یا ہو۔ ممکن ہے عام حالات ہوتے تو حیات اس چیخ کو اپنا وہم سمجھتا کیونکہ ہواؤں کا شور بھی تھا لیکن ان حالات میں وہ چونکا رہتا چاہتا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی الماری سے پستول نکالا۔ یہ شہزاد کا پستول تھا اور اس کا لائسنس بھی تھا۔ وہ جیکٹ اور کن ٹوپ پہن کر باہر نکلا۔ اس کے باوجود سردی نے ایک لمحے کو اسے سن کر دیا۔ آواز نیچے باغ کی طرف سے آتی محسوس ہوئی تھی اس لیے وہ نیچے کی طرف بڑھا۔ وہ رضوان کی کوٹھری سے کچھ دور تھا کہ چیخ دوبارہ سنائی دی اور پھر رضوان کی کراہتی آواز آئی۔

”مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

”جھوٹ مت بولو، وہ عورت یہیں ہے اسی جنگل میں۔ تم ایک ملازم ہو، مالک سے وفاداری کے چکر میں اپنی جان مت گنواؤ۔“ ایک اجنبی کی غراتی آواز آئی۔

”کون ہے؟“ حیات نے گرج کر کہا اور ایک ہوائی فائر کیا۔ وہ براہ راست گولی چلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا



دوایا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک گھر میں

# گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد

رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے

ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر

رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مینی گرام کے

ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر

بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمارہ (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹرسٹ ہاؤسنگ اتھارٹی مین کوئٹہ روڈ، کراچی  
فون: 35895313 فیکس: 35802551

آرام سے نیت استعمال کر سکے۔ حیات اب تک اسے بچی ہی سمجھتا آیا تھا لیکن آج اس نے جس طرح بات کی تھی وہ بچیوں والا انداز نہیں تھا۔

حیات پریشان ہو گیا۔ رات فارم میں گھس آنے والے آدمیوں کا واقعہ ہی کم نہیں تھا اور اسے سوہانہ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں آیا تو وہ اپنا بیگ تیار کر رہی تھی۔ حیات نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس سے بیگ لے لیا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

”میں یہاں سے جا رہی ہوں۔“ اس نے رخ پھرتے ہوئے کہا لیکن حیات نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے۔

”کیوں؟“

”ٹھیک ہے، میرا پس منظر عزت دار نہیں ہے لیکن میں اتنی بے عزتی کے بعد یہاں نہیں رک سکتی۔“

”کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے؟“

”نہیں لیکن آئی تک تو یہ بات پہنچ گئی ہے۔ کیا اب میں ان سے نظریں ملا سکوں گی؟“ وہ روہا سی ہو گئی۔

”پلیز سوہانہ! یہ اچھا نہیں ہوا ہے لیکن باہر اس وقت تمہارے لیے خطرہ ہے۔“

”کیا خطرہ ہے؟ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔ اب وہ مجھے واپس نہیں لے جاسکتے۔“ سوہانہ نے عزم کے ساتھ کہا۔ ”آپ میری فکر چھوڑیں اور اس خطرے کی فکر کریں جو اس گھر کو ڈوب دینا چاہتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ حیات چونکا۔

سوہانہ نے آنسو صاف کیے۔ ”حیات! میری آپ سے درخواست ہے، مجھے جانے کی اجازت دیں۔ میں آپ کو ناراض کر کے نہیں جانا چاہتی۔“

”اگر تمہیں میری اتنی ہی فکر ہے تو تم میری بات کیوں نہیں مان رہی ہو؟ صرف دو دن اور رک جاؤ پھر میں تمہیں خود چھوڑ کر آؤں گا۔“ حیات نے کہا اور اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اس کی ہدایت پر ملازمہ نے دوپہر کا کھانا سوہانہ کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کھانے کے لیے باہر نہیں آئے گی۔ کھانے کے بعد اس نے ممتاز کو کال کر کے رات والے واقعے کی اطلاع دی۔ اس نے پوچھا۔

”آپ ایف آئی آر درج کرانا چاہتے ہیں؟“

”نہیں... میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ نقاب پوش تھے اور میرے ملازم پر تشدد کرتے رہے۔“

ہم اسے کہاں تلاش کرتے پھریں گے؟“

”یہ پولیس کا کام ہے، وہ خود تلاش کر لے گی۔“

”پلیز امی! چند دن کی بات ہے۔“ حیات نے التجا کی۔ جیلہ مان نہیں رہی تھی مگر جب حیات نے بار بار اصرار کیا تو وہ اس شرط پر مانی کہ سوہانہ دو دن سے زیادہ یہاں نہیں رہے گی۔ حیات نے پھر کچھ نہیں کہا کہ دو دن کی مہلت بھی غنیمت تھی۔ اسے شکلیہ پر غصہ آ رہا تھا کہ ایک تو اس نے چھپ کر ان کی باتیں سنیں اور پھر جا کر جیلہ سے کہہ بھی دیں۔ وہ اس سے بھی بات کر سکتی تھی۔ وہ اس کے کمرے میں آیا تو وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ”تم نے میری اور سوہانہ کی باتیں چھپ کر سنی ہیں؟“

”ہاں۔“ وہ جرات سے بولی۔ ”آپ اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟ مجھے لگ رہا ہے کہ یہی شہزاد بھائی کی قاتل ہے۔“

”اگر وہی شہزاد کی قاتل ہے، تب بھی سچ نہیں سکے گی۔ لیکن بغیر ثبوت کے ہمیں اس پر الزام نہیں لگانا چاہیے۔“

”آپ کے پاس ثبوت ہے کہ وہ بے گناہ ہے؟“

”ہاں، فی الحال حالات اس کی بے گناہی ثابت کر رہے ہیں۔“ حیات نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اب تم امی سے کوئی بات نہیں کرو گی۔“

شکلیہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے چہرے پر سخت تاثرات تھے۔ جب حیات یہاں سے گیا تھا تو شکلیہ گیارہ سال کی بچی تھی اور حیات سے اس کا رشتہ بہت احترام والا تھا۔ اب ان میں بے تکلفی نہیں تھی بلکہ وہ حیات کے سامنے بہت کم بولتی تھی۔ آنے والے دنوں میں بھی اس کا یہی رویہ برقرار رہا۔ فون پر وہ سلام دعا اور مختصر بات کرتی تھی۔ جب چار سال پہلے حیات آیا تو اس کے لیے ڈھیروں چیزیں لے کر آیا تھا وہ تب بھی کاموں میں یا اپنے میں مگن رہتی۔ خود سے بھائی سے بات نہیں کرتی تھی۔ البتہ اس نے ایک فرمائش خود سے کی تھی۔ اس نے حیات سے کہا۔ ”مجھے موبائل چاہیے۔“

اس وقت تک کلر اسکرین اور کیمرے والے موبائل آگئے تھے لیکن خاصے مہنگے تھے۔ حیات نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا اور اس نے شکلیہ کو ایک اچھا سا موبائل والا دیا۔ وہ خوش ہو گئی تھی اور بار بار اس کا شکریہ ادا کرتی تھی۔

پھر تین سال پہلے اس نے ایک آنے والے کے ہاتھ شکلیہ کے لیے آئی فون اور ایک جدید لیپ ٹاپ بھجوا دیا تھا۔ شہزاد کو کمپیوٹر کا شوق نہیں تھا لیکن شکلیہ کے لیے اس نے فون لائن کو ڈی ایس ایل کر لیا اور وائی فائی کنکشن سیٹ کرایا تاکہ شکلیہ

”تمہیں پسند آیا ہے لیکن میرا خیال ہے یہ تمہیں نہیں آئے گا۔“

”میں واپس کر دوں گی۔“

حیات کا خیال تھا کہ وہ ڈیزائن کے لیے مانگ رہی ہے۔ اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، لے جاؤ۔“

سوہانہ اس کے کمرے سے نکل گئی۔ اگلی صبح حیات نے ناشتے کی میز پر محسوس کیا کہ جیلہ کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔

اس نے سوہانہ سے کوئی بات نہیں کی اور ناشتے کے بعد اٹھتے ہوئے بولی۔ ”حیات! میرے کمرے میں آؤ۔ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

شکلیہ بھی چپ تھی۔ حیات ماں کے کمرے میں آیا۔ وہ کسی قدر برہم لگ رہی تھی۔ اس نے حیات سے کہا۔ ”سوہانہ کل رات تمہارے کمرے میں کیا کر رہی تھی؟“

اس پر حیات نے اسے پورا واقعہ سنایا کہ کس طرح کچھ لوگوں نے فارم میں گھس کر رضوان پر تشدد کیا اور اس نے ہوائی فائرنگ کی تو وہ بھاگ گئے۔ اس نے سوہانہ کا ذکر درمیان سے نکال دیا تھا۔ مگر یہ بات سن کر بھی جیلہ کی برہمی کم نہیں ہوئی۔ ”اس لڑکی کا شہزاد سے کیا چکر تھا؟“

حیات چونکا۔ ”امی! آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی؟“

”مجھے جیسے بھی پتا چلی لیکن تم مجھ سے چھپاتے رہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یہ ایک بڑی عورت ہے اور اس کا تعلق ایک بڑی جگہ سے ہے؟“

حیات دنگ رہ گیا۔ ”امی! آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟“

”شکلیہ نے بتایا ہے۔ اس نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔“

حیات نے گہری سانس لی۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ شہزاد سوہانہ سے محبت کرتا تھا اور اس کا تعلق ایک بڑی جگہ سے تھا لیکن اب نہیں ہے۔ شہزاد کی محبت میں وہ سب چھوڑ کر وہاں سے نکل آئی ہے۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ میں اس لڑکی کو اپنی چھت کے نیچے برداشت نہیں کر سکتی۔“ جیلہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”اسے ابھی یہاں سے نکال دو۔“

”وہ بہت دنوں کے لیے نہیں آئی ہے۔ میں اسے...“

بلادجلہ لا بھی نہیں ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ شہزاد کے قتل سے اس کا کوئی تعلق ہے۔“

”اسی کی وجہ سے وہ مارا گیا ہے؟“ شکلیہ تلخ لہجے میں بولی۔

”اگر یہ کہیں چلی گئی اور بعد میں اس کا کوئی تعلق نکلا تو



# روزمرہ تھکن کو بدل ڈالنے جستی اور توانائی میں! VITALITA SYRUP

Food Supplement for Vitality

Verified by  
PCSI

Rs.250/-

ایک انمول خزانہ  
ہر دم رکھے توانا

★ بدن کو معدنیات کی فراہمی

★ پروٹین کی کمی کا خاتمہ

★ دماغی کارکردگی میں بہتری

★ بدن کے لئے جستی اور توانائی

★ بیماریوں کے خلاف بھرپور مدافعت

★ ہر عمر کے مردوں اور عورتوں کے لئے

★ سائنڈ ایفکٹ سے مکمل محفوظ

★ روزمرہ کاموں کے لئے بھرپور توانائی

وائٹالیٹا سیرپ بذریعہ کوریئر/ وی پی پی

اپنے گھر منگوانے کیلئے فون کیجئے

0315-3830001, 0315-3830002

کراچی میں وائٹالیٹا سیرپ حاصل کرنے کیلئے

مراد میڈیکو اسٹیڈیم روڈ، نزد آغا خان ہسپتال  
0213-4943664

786 میڈیکل سٹور بلاک 17، گلستان جوہر نزد جوہر چرچ رگلی  
0213-4010647

یاد رکھیے، وائٹالیٹا سیرپ کسی اور دوسرے

میڈیکل سٹور یا رابطہ نمبر کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا

پر تھیں۔ حیات کو سمجھنے میں لمحہ بھی نہیں لگا کہ وہ عورت جینا ہے۔ وہ سوہانہ سے کہہ رہی تھی۔  
”تم سمجھ رہی تھیں کہ میں تمہیں تلاش نہیں کر سکوں گی؟“  
”مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔“ سوہانہ نے سکون سے کہا۔ ”لیکن اگر تم یہ سوچ کر آئی ہو کہ مجھے یہاں سے لے جاؤ گی تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“

”اچھا۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”کیا کر لو گی؟“  
جواب میں سوہانہ نے اپنا پستول نکالا تو جینا کے مستعد محافظوں نے لمحے بھر میں اپنے ہتھیار نکال کر سوہانہ پر تان لیے۔ ایک نے لٹاکر کہا۔ ”اے سپینک دو۔“  
سوہانہ مسکرائی۔ ”ذرو مت... یہ مادام کے لیے نہیں ہے۔“ سوہانہ نے پستول کی نال اپنی کپٹی پر رکھ لی۔ ”میں خود کشی کر لوں گی۔“

”اتنا آسان سمجھا ہے۔“ جینا مزید طنزیہ انداز میں ہنسی۔ ”مجھے پہلے خیال نہیں آیا کہ تم اس چھوکرے کے چکر میں ہو۔“

”چلو اب پتا چل گیا۔“ سوہانہ نے کہا۔ ”یہ تو طے ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“  
”میں تمہیں لے کر جاؤں گی۔“ جینا غرائی۔  
”تب خدا حافظ۔“ سوہانہ نے کہا اور ٹریگر دبانے لگی کہ حیات عقب سے چھٹا اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر اوپر کر دیا۔ گولی چلی اور چھت کی طرف گئی۔ اس سے پہلے کہ سوہانہ دوبارہ گولی چلائی، حیات نے اس سے پستول چھین لیا۔  
”یہ کیا کر رہی تھیں؟“

وہ پچھلے انداز میں مسکرائی۔ ”آپ... میں نے کہا تھا تانجھے یہاں سے جانے دیں۔“  
”تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ حیات نے پختہ لہجے میں کہا۔  
”جینا تمہیں نہیں لے جاسکے گی۔“

”میرا سوہانہ سے معاہدہ ہے۔“ جینا حیکھے لہجے میں بولی۔ اس نے اپنے پرس سے رول کیا ہوا کاغذ نکال کر لہرایا۔ ”یہ پانچ سال سے پہلے مجھے نہیں چھوڑ سکتی۔ ویسے تم کون ہو؟“

”میں شہزاد کا بڑا بھائی حیات احمد ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس معاہدے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کیا تم اسے لے کر کسی عدالت میں جاؤ گی؟“  
”میں اپنے معاہدے کی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔“  
جینا نے غرور سے کہا۔

”سوہانہ میرے بھائی سے شادی کرنے والی تھی اس

ادائیگی کی اور باہر آ گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ جینا ہاؤس والے اس کے گھر تک کیسے آئے؟ انہیں وہیں سے کال کی گئی تھی اور ظاہر ہے یہ کال سوہانہ نے کی تھی۔ صرف وہی وہاں کے نمبرز جانتی تھی۔ حیات کا بلڈ پریشر بڑھنے لگا۔ اسے غصہ کم آتا تھا لیکن جب آتا تو بہت بے قابو کر دینے والا آتا تھا۔ اس وقت اسے ایسا ہی غصہ آ رہا تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ گھر جانے سے گریز کرے۔ وہ اس مسئلے کو ٹھنڈے دماغ کے ساتھ حل کرنا چاہتا تھا۔ پھر اسے پہلے نمبر کا خیال آیا جو کسی موبائل کا تھا اور وہ جان گیا تھا کہ وہ نمبر کس کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن پلٹنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر سوہانہ اس سازش میں اس فرد کے ساتھ شریک تھی تو وہ اس کے گھر میں کیوں موجود ہے؟ مگر حالات بتا رہے تھے کہ وہ اس کے ساتھ ملوث نہیں تھی، تب اسے کس نے کال کی تھی؟ جیسے جیسے وہ سوچ رہا تھا، اس کے اندر ایک نیا شبہ سر اٹھ رہا تھا۔

وہ سوچتا رہا اور سڑکوں پر چکر اتار رہا۔ رات ہوئی تو وہ چونکا اور اس نے کار کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا۔ اب اس کا دماغ ٹھنڈا تھا اور وہ جذبات میں آئے بغیر بات کر سکتا تھا۔ وہ فارم میں داخل ہوا لیکن کوشی کے پورچ میں ایک بڑی گاڑی کی جھلک دیکھ کر وہ راستے میں رک گیا۔ اس نے تیزی سے انجن اور لائٹیں بند کر دیں اور پھر اتر کر دبے قدموں اوپر بڑھا۔ یہ خاصی بڑی اور گھڑی قسم کی گاڑی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی آدمی موجود تھا۔ اس کا ہیولہ پورچ کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ حیات دبے قدموں نیچے آیا اور اس نے رضوان کی کوشی میں جھانکا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ پھر اوپر آیا اور اس بار کوشی کی چار دیواری کے ساتھ گھومتا ہوا عقب میں نگلا۔ چار دیواری سات فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح اسے پار کیا اور عقب میں پگن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے ڈر تھا کہ دروازہ اندر سے بند نہ ہو لیکن خوش قسمتی سے وہ کھلا ہوا تھا۔ ملازمائیں سردیوں میں چھ بجے تک چلی جاتی تھیں اس لیے اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ نشست گاہ میں کوئی ہے وہاں سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ دبے قدموں وہاں تک آیا۔ وہاں کئی افراد تھے۔ ایک طرف صوفے پر جیلہ اور شکیلہ ایک دوسرے سے جڑی بیٹھی تھیں۔ ان سے کچھ دور سوہانہ کھڑی تھی اور اس کے سامنے صوفے پر ایک ادھیڑ عمر لیکن خوب صورت سفید فام عورت شاہانہ انداز میں بیٹھی تھی۔ اس کے پیچھے دو تومند مقامی مرد مودب انداز میں کھڑے تھے لیکن ان کی عقابی نگاہیں سوہانہ، جیلہ اور شکیلہ

اس نے شاہ پور کے ایک پی سی او سے پہلے موبائل نمبر ملوایا اور جب دوسری طرف سے کال ریسپونڈ کی گئی تب بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔ دوسری طرف موجود فرد ”ہیلو... ہیلو“ کرتا رہا اور حیات اس کی آواز پر غور کرتا رہا پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔ حیات نے پی سی او والے کو دوسرا نمبر ملانے کو کہا، یہ فلکسڈ نمبر تھا۔ دوسری طرف سے کال ریسپونڈ کی گئی اور کسی سریلی آواز والی لڑکی نے کہا۔ ”جینا ہاؤس۔“

حیات نے ریسپونڈ رکھ دیا۔ پی سی او والا حیران تھا کہ اس نے دونوں کالز پر کوئی بات... نہیں کی۔ حیات نے

”وہ کیا چاہتے تھے؟“

”وہ رضوان سے گھر والوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“ حیات نے غلط بیانی سے کام لیا۔ اگرچہ بولتا تو اسے سوہانہ کے بارے میں بتانا پڑتا۔

”تب ممکن ہے وہ ڈاکو ہوں۔“ ممتاز نے کہا۔ ”میں شاہ پور میں گشت کرنے والوں کو ہدایت کر دیتا ہوں۔ وہ یقیناً رات کو کہیں آرام کرتے رہتے ہوں گے۔“  
”ہو سکتا ہے۔ میرا کوئی نقصان تو نہیں ہوا لیکن میں نے سوچا کہ آپ کو اطلاع دے دوں۔“

”آپ نے ٹھیک کیا۔“ ممتاز بولا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ اب شہزاد کے دوستوں کو پولیس اسٹیشن بلا کر ان سے بات کروں۔ گھر کے مقابلے میں یہاں ان سے ذرا مختلف انداز میں بات کی جاسکتی ہے۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ حیات بولا۔ ”مجھے یقین ہے، آپ جلد قافل تک پہنچ جائیں گے۔“  
”امید تو یہی ہے۔“

ممتاز سے بات کر کے حیات وہیں فون کے پاس بیٹھ گیا اور پھر اس نے بے خیالی میں فون کا ڈائل ہسٹری والا بٹن دبایا تو گزشتہ کالوں کا ریکارڈ سامنے آ گیا۔ اس نے فہرست دیکھی اور چونک گیا۔ اسے دو نمبر اجنبی لگے۔ ایک نمبر موبائل تھا لیکن دوسرا نمبر فلکسڈ لائن تھا۔ حیات نے دونوں کو نوٹ کر لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ کالز کس وقت ہوئی تھیں۔ دونوں کالز گزشتہ رات بارہ بجے سے کچھ پہلے ہوئی تھیں۔ حیات کی پیشانی پر ٹل آ گئے۔ یہاں سے کسی نے اس وقت کال کی تھی اور اس کے شاید ایک گھنٹے بعد وہ لوگ فارم میں گھسے تھے جو سوہانہ کا پوچھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا۔ موسم رات کے مقابلے میں بہتر تھا۔ آسمان پر بادل تھے لیکن برف باری یا طوفان کا امکان نہیں تھا۔ رات بھی برف باری تو کم ہوئی تھی لیکن ہوائیں بہت تیز اور سخت تھیں۔

اس نے شاہ پور کے ایک پی سی او سے پہلے موبائل نمبر ملوایا اور جب دوسری طرف سے کال ریسپونڈ کی گئی تب بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔ دوسری طرف موجود فرد ”ہیلو... ہیلو“ کرتا رہا اور حیات اس کی آواز پر غور کرتا رہا پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔ حیات نے پی سی او والے کو دوسرا نمبر ملانے کو کہا، یہ فلکسڈ نمبر تھا۔ دوسری طرف سے کال ریسپونڈ کی گئی اور کسی سریلی آواز والی لڑکی نے کہا۔ ”جینا ہاؤس۔“

حیات نے ریسپونڈ رکھ دیا۔ پی سی او والا حیران تھا کہ اس نے دونوں کالز پر کوئی بات... نہیں کی۔ حیات نے



لیے اب یہ ہماری عزت ہے۔“ حیات نے کہا۔ ”لیکن میں تم سے جھگڑا نہیں چاہتا۔ اس کا رویہ تم نے دیکھ لیا ہے، یہ مر جائے گی۔ کوئی اور راستہ نکالو۔“

سوہانہ کی حرکت نے جینا کو چونکا دیا تھا ورنہ وہ اسے بلف سمجھ رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”ایک راستہ ہے... ابھی سوہانہ سے میرا معاہدہ گیارہ مہینے کا باقی ہے۔ اگر یہ مجھے اس عرصے کا ہر جانہ ادا کر دے تو میں اسے معاہدے سے آزاد کر دوں گی۔“

”کتنا ہر جانہ؟“ سوہانہ بولی۔

”میں بے انصافی نہیں کروں گی۔ گزشتہ سال میں تم نے مجھے پچیس لاکھ کما کر دیے۔ ان میں سے دس تمہارے تھے۔ اس لیے تم پچیس لاکھ دے دو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گی؟“

”پچیس لاکھ کیوں؟“ سوہانہ بولی۔

”مجھے منظور ہے۔“ حیات نے کہا اور سوہانہ کی طرف دیکھا۔ ”وہ پچیس لاکھ کا چیک اسے لا دو۔“

”میں چیک کا کام نہیں کرتی ہوں۔“ جینا نے کہا۔

”کیش کا چیک ہے۔“ حیات نے کہا۔ ”لیکن تمہیں کچھ عرصے انتظار کرنا پڑے گا۔ ابھی عدالتی حکم کے بغیر اکاؤنٹ سے کچھ نہیں نکالا جاسکتا۔“

سوہانہ نے چیک لا کر دیا۔ جینا نے دیکھا۔ ”شہزاد کے اکاؤنٹ کا ہے؟“

”ہاں، یہاں میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے ورنہ میں تمہیں کیش دے دیتا۔ تم بے شک معاہدہ اپنے پاس رکھو جب چیک کیش ہو جائے تب دے دینا۔“

”تم خاندانی آدمی ہو۔“ جینا نے جواب میں کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”مجھے تم پر اعتبار ہے۔“ وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”کیا تم میرے ایک سوال کا جواب دو گی؟“ حیات نے کہا۔

”یوچھو۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ سوہانہ یہاں موجود ہے؟“

”ایک فون کال سے اطلاع ملی تھی جو اس گھر سے کی گئی تھی۔ لیکن یہ نہیں پتا کہ وہ کون تھی۔“ جینا نے کہا اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے گھر کے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ پہلے ان کا رویہ جارحانہ تھا لیکن جب ان کے درمیان مفاہمت ہو گئی تو ان کے ہتھیار بھی واپس لباس میں چلے گئے تھے۔ حیات اس کے جانے کے بعد باہر نکلا۔ رضوان چوکیدار والی کوٹھری میں بندھا پڑا تھا۔ آج اس پر تشدد نہیں ہوا تھا لیکن وہ

بہت زیادہ دہشت زدہ تھا۔ جیسے ہی حیات نے اسے آزاد کرایا، اس نے کہا۔ ”صاحب! مجھے تو معافی دو۔ اب میں یہاں ملازمت نہیں کر سکتا۔“

”مرضی تمہاری مگر اب کچھ نہیں ہوگا۔ ابھی تو جا کر اپنی کوٹھری میں آرام کرو۔“

حیات واپس آیا تو سوہانہ خاموش کھڑی تھی۔ جیلہ اور شکیلہ اسے نفرت سے گھور رہی تھیں۔ حیات کے آتے ہی شکیلہ نے کہا۔ ”بھائی، اسی نے فون کر کے ان لوگوں کو اطلاع دی ہوگی۔“

”فون میں نے نہیں تم نے کیا تھا۔“ سوہانہ سکون سے بولی۔ ”اب اپنے بھائی کو بتاؤ کہ تمہارے پاس جینا ہاؤس کا نمبر کہاں سے آیا؟“

”یہ... یہ بکواس کر رہی ہے۔“ شکیلہ بھلائی۔

”حیات! تو اس کی بکواس سن رہا ہے، اسے باہر نکال۔“ جیلہ غصے سے بولی۔ ”نہ جانے یہ گند کہاں سے ہمارے گھر میں آگئی۔“

”امی! گند ہمارے گھر میں پہلے سے موجود ہے۔“ حیات نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا تا کہ آپ ان دونوں کا خیال رکھیں گی لیکن افسوس آپ نے ان پر نظر نہیں رکھی۔ شہزاد اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ اسے سوہانہ کی محبت نے سنبھال لیا اور وہ شراب اور بُرائی کی دنیا سے نکل آیا لیکن...“ اس نے شکیلہ کو دیکھا۔

”میں... میں نے کچھ...“

”چپ کرو۔“ حیات گرجا۔ ”اگر تم میری بہن ہو تو شہزاد میرا بھائی تھا اور اس کا قاتل کوئی بھی ہو، میں اسے بخشوں گا نہیں۔ کیا تعلق ہے تمہارا منصور سے...؟“

”کوئی تعلق نہیں ہے... بھائی... کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ بلبلائی۔

”حیات تو...“

”امی! آپ چپ کر کے دیکھیں۔“ حیات بولا اور سوہانہ کی طرف مڑا۔ ”تم نے وہ لباس کیوں مانگا تھا مجھ سے جو سوٹ کیس سے نکلا تھا؟“

”میں نے ویسا ہی لباس شکیلہ کے پاس دیکھا تھا اور یہ ریڈی میڈ نہیں تھا بلکہ سلوایا گیا تھا۔“ سوہانہ بولی۔ حیات کمرے سے سوٹ کیس لے آیا اور ماں کے سامنے رکھ دیا۔

”اسے پہچانتی ہیں آپ؟ یہ سوٹ کیس اور یہ کپڑے...“ اس نے سوٹ کیس کھول دیا۔ جیلہ کی پھٹی پھٹی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ اس نے کپڑے شناخت کر لیے تھے۔

”سوٹ کیس شہزاد کی گاڑی سے ملا ہے جس رات اسے قتل کیا گیا۔“ یہ کہتے ہوئے حیات غصے سے بے قابو ہو گیا اور اس نے شکیلہ کے بال پکڑ کر اسے گھما کر صوفے پر پھینک دیا۔ وہ چیخ اٹھی مگر حیات کی دھاڑ اس سے بلند تھی۔ ”بول... خیرے یہ کپڑے وہاں کیسے آئے؟“

شکیلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

سوہانہ اور حیات باغ میں ٹہل رہے تھے۔ مارچ کا آغاز تھا اور درختوں پر نئے پتے نمودار ہو رہے تھے۔ سردی کا موسم گزر چکا تھا۔ زمین پر خوش رنگ گھاس اور پودے اگ رہے تھے۔ حیات سنجیدہ تھا۔ ”ہمارے معاشرے کو جینا جیسے لوگ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ باہر سے آنے والی دولت کا بے تحاشا استعمال... موبائلز اور انٹرنیٹ جیسی سہولتوں کا غلط استعمال ہے۔“

سوہانہ نے سر ہلایا۔ ”شہزاد کو میں جانتی ہوں اور میرے خیال میں شکیلہ بھی فطرت کی بُری نہیں ہے۔ لیکن اسے کوئی چیک کرنے اور سمجھانے والا نہیں تھا۔ اسے آزادی ملی اور وہ بگڑ گئی۔“

”منصور سے اس کا رابطہ موبائل کی مدد سے ہوا اور وہ امی اور شہزاد سے چھپ کر اس سے رابطہ رکھتی تھی۔ لیکن اتنی ہمت نہیں رکھتی تھی کہ اس سے کہیں باہر ملتی۔ اس کے لیے منصور نے یہ ترکیب نکالی کہ اس نے شہزاد سے دوستی کر لی۔ شہزاد اس کی چال سے بے خبر تھا پھر اس نے شہزاد کو مزید غافل کرنے کے لیے اسے شراب اور بعد میں منشیات کی راہ پر لگا دیا۔ اس میں خود شہزاد کا قصور بھی تھا لیکن تم سے مل کر اسے احساس ہو گیا کہ وہ تباہی کے راستے پر چل رہا ہے۔ اس نے شراب اور منشیات ترک کر دی۔“

اس دوران میں شہزاد کو شک ہو گیا کہ شکیلہ اور منصور کا آپس میں کوئی رابطہ ہے۔ وہ ان کی کھوج میں لگ گیا۔ جلد حقیقت اس کے سامنے آگئی اور اس نے شکیلہ پر سختی کی اور منصور کو بھی دھمکی دی کہ وہ اس کی بہن سے رابطہ نہیں کرے گا۔ شہزاد اس کی اصلیت جانتا تھا۔ منصور نہ صرف بدکردار تھا بلکہ شراب اور مارفین کا عادی بھی تھا۔ اس کے صرف شکیلہ سے نہیں بلکہ اور بھی کئی دوسری لڑکیوں سے تعلقات تھے۔ اس کا جینا ہاؤس آنا جانا تھا۔ ظاہر ہے، وہ وہاں عیاشی کے لیے جاتا تھا۔ وہ کسی صورت شکیلہ کے لیے مناسب نہیں تھا۔ شہزاد نے یہ سب شکیلہ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے سر پر منصور کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شہزاد

زرگذیدہ

اسے منصور سے دور کرنے کے لیے یہ سب کہہ رہا ہے۔ شہزاد سے تلخ کلامی کے بعد منصور نے اس سے بدلہ لینے کے لیے شکیلہ کو گھر سے فرار پر اکسانا شروع کر دیا۔ شروع میں وہ نہیں مانی تھی لیکن رفتہ رفتہ منصور نے اسے راضی کر لیا۔

طے ہوا کہ اکیس دسمبر کی رات شکیلہ گھر سے نکلے گی اور وہ دونوں پہلے لاہور جائیں گے جہاں وہ شادی کریں گے اور اس کے بعد وہ کراچی چلے جائیں گے جہاں منصور کے بہن بہنوئی رہتے تھے۔ منصور نے شکیلہ کو جھانسا دیا کہ وہ کراچی سے آگے کسی اور ملک چلے جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے آزاد زندگی گزاریں گے۔ شکیلہ اس کی باتوں میں آگئی۔ وہ رات بارہ بجے سے پہلے چپکے سے اپنا سامان لے کر گھر سے نکلی۔ سڑک پر منصور گاڑی سمیت اس کا منتظر تھا۔ وہ روانہ ہوئے لیکن ان کی اور اصل میں شہزاد کی بد قسمتی کہ ان کا آپس میں آمناسامنا ہو گیا۔ شہزاد نے گاڑی روک لی اور وہ شکیلہ کو منصور کے ساتھ دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے شکیلہ اور اس کا سامان اپنی جیب میں رکھا اور پھر منصور کو مارنے کے لیے دوڑا۔ منصور کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، وہ جان بچانے کے لیے بھاگا۔ غصے سے بے قابو شہزاد اس کے پیچھے لگا رہا اور پھر جائے وقوعہ پر اس نے اسے جا لیا۔ دونوں ختم ہو گئے۔ جیب میں ہونے کی وجہ سے شہزاد نے جیکٹ اتار دی تھی اور صرف شرٹ میں تھا۔ دست بدست لڑائی کے دوران میں اس کی قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے۔ ایک موقع پر وہ گرا تو منصور نے پاس ہی پڑی بھاری شاخ اٹھائی اور شہزاد کے سر پر دے ماری۔ وار بہت قوت سے اور نازک جگہ تھا۔ شہزاد وہیں گر گیا۔ خوف زدہ منصور شاخ پھینک کر واپس بھاگا۔

اس دوران میں شکیلہ اتنی ڈری کہ جیب سے اتر کر پیدل ہی شاہ پور کی طرف روانہ ہو گئی۔ کئی میل کا فاصلہ طے کر کے وہ گھر پہنچی تو جیلہ بے خبر سو رہی تھی۔ شکیلہ نے جلدی سے اپنا حلیہ درست کیا اور منصور سے رابطہ کیا، تب منصور نے اسے بتایا کہ لڑائی کے دوران میں چوٹ لگنے سے شہزاد مر گیا ہے۔ منصور نے کچھ اس طرح بتایا کہ شکیلہ کو اس کی بات کا یقین آ گیا۔ اس نے ڈراما کیا اور جیلہ کو جگا کر بتایا کہ شہزاد اب تک گھر نہیں آیا۔ اسے سوٹ کیس کی فکر تھی جو شہزاد کی جیب میں رہ گیا تھا لیکن اطمینان کی بات تھی کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس کی طرف اشارہ کرتی۔ دوسری طرف منصور نے اپنی جان بچانے کے لیے یہ کیا کہ فوری کراچی روانہ ہو گیا۔ مظفر آباد سے صبح سویرے چلنے والی ایک کوچ



سے اس نے سفر کیا اور جب وہ کراچی پہنچا تو شہزاد کے قتل کی اطلاع آچکی تھی۔ اس نے گھر والوں کی مدد سے یہ ظاہر کیا کہ وہ دو دن سے کراچی میں تھا۔

اگر شکیلہ گھر سے منصور کو اور جینا ہاؤس کال نہ کرتی تو شاید اس کا بھید نہ کھلتا۔ اصل میں وہ سوہانہ کے بارے میں جانتی تھی اور اسے ڈرتھا کہ کہیں سوہانہ کے توسط سے اس کا پول نہ کھل جائے۔ اس کے دل میں چور تھا کہ شاید شہزاد نے سوہانہ کو اس کے اور منصور کے تعلق کے بارے میں بتا دیا تھا اس لیے اس نے پہلے ماں کو سوہانہ کے بارے میں بتایا اور پھر جینا ہاؤس کال کر دی۔ جینا ہاؤس کا نمبر منصور نے دیا تھا۔ اس کا مقصد بہر صورت سوہانہ کو یہاں سے چلتا کرنا تھا مگر حیات کی وجہ سے اس کا سوہانہ کو فوری نکالنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا اور وہ اندر ہی اندر تملتا رہی تھی پھر حیات گھر سے نکلا ہوا تھا تو جینا اپنے آدمیوں سمیت پہنچ گئی۔ وہ سوہانہ کو لے جانا چاہتی تھی۔ شکیلہ خوش ہو گئی لیکن صورت حال نے کچھ دیر بعد ایسا پلٹا کھایا کہ وہ خود گرفت میں آگئی اور اسے حیات کے سامنے اعتراف کرنا پڑا۔ حیات سے زیادہ جیلہ کا بُرا حال تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی بیٹی ہی اس کے بیٹے کی قاتل نکلے گی۔ وہ شکیلہ کو بے تحاشا مارنے لگی اور پھر خود بے ہوش ہو گئی۔

حیات نے اسی وقت ممتاز کو کال کی اور اس سے ملنے کو کہا۔ ممتاز نے اسے پولیس اسٹیشن بلوایا جہاں اس سے ساری بات سن کر اس نے منصور کا وارنٹ نکلوایا کیونکہ اسے یقین آ گیا تھا کہ منصور ہی قاتل ہے۔ شاخ پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے اور وہ میچ کر جاتے تو پھر کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ منصور کو پولیس نے اس کے گھر سے گرفتار کیا۔ لکڑی پر پائے جانے والے منگر پرنٹ اسی کے نکلے۔ پھر پولیس نے منصور نے جس کوچ سے سفر کیا، اس سے متعلق بھی معلومات حاصل کر لیں۔ راستے میں جہاں اس نے موبائل پر کال ریسیو کر کے بتایا تھا کہ وہ کراچی میں ہے موبائل کمپنی کی مدد سے وہ لوکیشن بھی نکال لی گئی تھی جو ملتان کے پاس کی تھی۔ پولیس نے اس پر تین سو دو کے تحت مقدمہ بنایا تھا اور ثبوت و گواہیاں اتنے مضبوط تھے کہ اسے کم سے کم عمر قید تو ہوتی۔ منصور کی گرفتاری اور اعتراف جرم کا سن کر شکیلہ کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا اور وہ دو ہفتے اسپتال میں داخل رہی لیکن اب اس کی حالت خاصی بہتر تھی۔

حیات نے شکیلہ کو معاف کر دیا تھا۔ وہ بہر حال اس کی بہن تھی۔ اس نے ماں کو بھی راضی کیا کہ وہ شکیلہ کو معاف کر

دے۔ ماں کا دل تو ویسے ہی نرم ہوتا ہے۔ حیات چاہتا تھا کہ اب وہ دونوں اس کے ساتھ ہی برطانیہ چلیں۔ ان دنوں وہ ان کے ویزے لگوا رہا تھا۔ حیات خیالوں سے چونکا۔ سوہانہ کہہ رہی تھی۔ ”یہ اچھا ہوا کہ منصور نے کہیں شکیلہ کا نام نہیں لیا ورنہ وہ بدنام ہو جاتی۔“

”ہاں اس لحاظ سے وہ اچھا ثابت ہوا۔ میں ممتاز کا بھی احسان مند ہوں۔ اس نے ذاتی کوشش کر کے شکیلہ کو اس کیس سے دور رکھا۔“ حیات نے کہا پھر اس نے سوہانہ کی طرف دیکھا۔ ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ سونا اور رقم تمہیں مل چکی ہے۔“

سوہانہ ہچکچائی۔ ”ارادہ کیا ہے؟ بس اب اکیلے زندگی گزاروں گی۔ کوئی مجھے میرے ماضی سمیت قبول نہیں کرے گا اور میں کسی کو دھوکا نہیں دے سکتی۔“

”میرے ذہن میں ایک تجویز ہے اگر تم غور کرو۔ اسے میری جذباتیت مت سمجھنا، میں نے اس پر بہت غور کیا ہے اور تب تم سے بات کر رہا ہوں۔“

”کیسی تجویز؟“

”مجھے اور تمہیں، شہزاد سے محبت ہے... کیوں نہ ہم اس محبت کو آپس میں شیئر کر لیں۔“

سوہانہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ مجھے پروپوز کر رہے ہیں... میرے بارے میں سب جانتے ہوئے بھی؟“

”ہاں کیونکہ میرا خیال ہے تم ایک اچھی لڑکی ہو اور بہت اچھی بیوی ثابت ہوگی۔ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے تو وہ اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے جس کا حال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میں بھی تمہیں خوش رکھ سکوں گا۔ تم خوش ہوگی تو شہزاد کی روح کو بھی سکون ملے گا۔ وہ تم سے محبت کرتا تھا اور یقیناً تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ ہمارے اس تعلق میں سب کی بہتری ہے۔ ہم انگلینڈ میں ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ بولو کیا کہتی ہو؟“

سوہانہ مسکرائی تو اس کی مسکان میں شرم تھی۔ ”میرے لیے اس سے بڑھ کر اعزاز کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن آئی...“

”میں امی سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں اور وہ خوشی سے راضی ہیں۔“ حیات نے اس کی بات کاٹ کر کہا تو سوہانہ کھل اٹھی۔ اس نے حیات کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں اوپر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔